سلسلۂ مطبوعات : ۲۰۰

انتخاب مضامین

سیّد سلیمان ندوی

مُرتّبہ

صباح الدین عبدالرحمٰن

اترپردیش اردو اکادمی
لکھنؤ

انتخاب مضامین سید سلیمان ندوی

مرتبہ: صباح الدین عبدالرحمن

سنۂ اشاعت: ۱۹۸۵

تعداد: ۱۰۰۰

قیمت: سات روپے

ستیش چندر سریواستو، سکریٹری اتر پردیش اردو اکادمی نے میسرس نشاط آفسٹ پریس ٹانڈہ فیض آباد سے چھپوا کر اکادمی کے دفتر بلہرہ ہاؤس، قیصر باغ لکھنؤ سے شائع کی۔

پیش لفظ

علامہ سید سلیمان ندوی علامہ شبلی نعمانی کے ممتاز ترین شاگردوں میں تھے۔ وہ اسلامیات کے ساتھ اردو، فارسی اور عربی ادب اور تاریخ بالخصوص تاریخ اسلام پر گہری نظر رکھتے تھے۔ انھوں نے علوم دینیہ سے متعلق کئی کتابوں کے علاوہ بڑی تعداد میں ادبی مضامین بھی لکھے جو مواد کے علاوہ اسلوب کے اعتبار سے بھی بہت اہم ہیں۔ سید صاحب دار المصنفین کے مشہور جریدے "معارف" (اعظم گڑھ) کے معماروں میں تھے اور انھوں نے اس رسالے کو طویل مدت تک اپنے فکر و قلم کے وسیلے سے فیض یاب کیا۔ وہ 'الندوہ' (لکھنؤ) کی بھی برابر قلمی معاونت کرتے رہے۔

اردو زبان و ادب سے متعلق سید سلیمان ندوی کے مضامین کا ایک مجموعہ 'نقوش سلیمانی' کے نام سے شائع ہوا تھا۔ زیر نظر انتخاب اسی مجموعے سے کیا گیا ہے۔ اس انتخاب میں شامل چھ مضامین میں سے تین میں اردو زبان کی تاریخ اور لفظیات سے فکر انگیز اور دل چسپ بحث کی گئی ہے۔ دو کا تعلق ادب سے ہے اور آخری مضمون ہندستان کی تاریخ نویسی کے بارے میں کچھ ہدایات پر مبنی ہے۔

اس انتخاب کا مطالعہ قومی یک جہتی کے نقطۂ نظر سے بہت مفید ثابت ہو سکتا ہے اور اس سے اردو اور ہندی کے درمیان پھیلے ہوئے لسانی تعصب کے تاریک بادل بھی چھنٹ سکتے ہیں۔

سید صاحب نے اپنے مضامین میں صرف سنین ہجری دیے تھے، جدید تقاضوں کے پیش نظر ان کے مطابق سنین عیسوی بھی درج کر دیے گئے ہیں۔

یہ انتخاب بھی، جس کی ترتیب کے لیے اکادمی علامۂ سید سلیمان ندوی کے تربیت یافتہ اور اب جانشین جناب سید صباح الدین عبد الرحمٰن کی ممنون ہے، امید ہے اکادمی کی دوسری کتابوں کی طرح قبول عام حاصل کرے گا۔

محمد رضا انصاری
چیرمین مجلس انتظامیہ

اتر پردیش اردو اکادمی،
لکھنؤ
یکم اکتوبر ۱۹۸۵ء

ترتیب

دیباچہ ۷
ہندوستان میں ہندوستانی ۹
لکھنؤ کی ادبی خدمات ۴۹
بعض پرانے لفظوں کی نئی تحقیق ۶۶
تہنیہ ۹۶
اکبر کا ظریفانہ کلام ۱۱۰
ہندوستان کی تاریخ کیسی لکھی جائے ۱۲۱

انتخاب مضامین سید سلیمان ندوی

مرتبہ: صباح الدین عبدالرحمٰن

سنہ اشاعت: ۱۹۸۵

تعداد: ۱۰۰۰

قیمت: سات روپے

ستیش چندر سریواستو، سکریٹری اتر پردیش اردو اکادمی نے میسرس نشاط آفسٹ پریس ٹانڈہ فیض آباد سے چھپوا کر اکادمی کے دفتر بلہرہ ہاؤس، قیصر باغ لکھنؤ سے شائع کی۔

پیش لفظ

علامہ سید سلیمان ندوی علامہ شبلی نعمانی کے ممتاز ترین شاگردوں میں تھے۔ وہ اسلامیات کے ساتھ اردو، فارسی اور عربی ادب اور تاریخ بالخصوص تاریخ اسلام پر گہری نظر رکھتے تھے۔ انھوں نے علوم دینیہ سے متعلق کئی کتابوں کے علاوہ بڑی تعداد میں ادبی مضامین بھی لکھے جو مواد کے علاوہ اسلوب کے اعتبار سے بھی بہت اہم ہیں۔ سید صاحب دار المصنفین کے مشہور جریدے "معارف" (اعظم گڑھ) کے معماروں میں تھے اور انھوں نے اس رسالے کو طویل مدت تک اپنے فکر و قلم کے وسیلے سے فیض یاب کیا۔ وہ 'الندوہ' (لکھنؤ) کی بھی برابر قلمی معاونت کرتے رہے۔

اردو زبان و ادب سے متعلق سید سلیمان ندوی کے مضامین کا ایک مجموعہ 'نقوشِ سلیمانی' کے نام سے شائع ہوا تھا۔ زیر نظر انتخاب اسی مجموعے سے کیا گیا ہے۔ اس انتخاب میں شامل چھ مضامین میں سے تین میں اردو زبان کی تاریخ اور لفظیات سے فکر انگیز اور دل چسپ بحث کی گئی ہے۔ دو کا تعلق ادب سے ہے اور آخری مضمون ہندستان کی تاریخ نویسی کے بارے میں کچھ ہدایات پر مبنی ہے۔

اس انتخاب کا مطالعہ قومی یک جہتی کے نقطۂ نظر سے بہت مفید ثابت ہوسکتا ہے اور اس سے اردو اور ہندی کے درمیان پھیلے ہوئے لسانی تعصب کے تاریک بادل بھی چھنٹ سکتے ہیں۔

سید صاحب نے اپنے مضامین میں صرف سنین ہجری دیے تھے، جدید تقاضوں کے پیش نظر ان کے مطابق سنین عیسوی بھی درج کردیے گئے ہیں۔

یہ انتخاب بھی، جس کی ترتیب کے لیے اکادمی علامۂ سید سلیمان ندوی کے تربیت یافتہ اور اب جانشین جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن کی ممنون ہے، امید ہے اکادمی کی دوسری کتابوں کی طرح قبول عام حاصل کرے گا۔

محمد رضا انصاری
چیرمین مجلس انتظامیہ

اتر پردیش اردو اکادمی،
لکھنؤ
یکم اکتوبر ۱۹۸۵ء

ترتیب

دیباچہ ۷
ہندوستان میں ہندوستانی ۹
لکھنؤ کی ادبی خدمات ۴۹
بعض پرانے لفظوں کی نئی تحقیق ۶۶
تہنید ۹۶
اکبر کا ظریفانہ کلام ۱۱۰
ہندوستان کی تاریخ کیسی لکھی جائے ۱۲۱

دیباچہ

حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ قرآنیات، حدیث، کلام، فقہ اور تاریخ کے بہت بڑے ماہر تھے۔ ان علوم پر اپنی تصانیف کے علاوہ الندوہ (لکھنؤ) اور معارف (اعظم گڈھ) میں بکثرت مضامین لکھے۔ وہ ان کے مجموعے شائع کرتے تو ان کی بہت سی جلدیں ہو جاتیں۔ جو اپنی زندگی میں شائع کرنا پسند نہیں کیا، لیکن انھوں نے اردو زبان اور ادب سے متعلق جو کچھ لکھا، ان کو اپنی حیات ہی میں بڑے شوق سے "نقوشِ سلیمانی" کے نام سے شائع کیا۔ جس سے ظاہر ہے کہ ان کو اردو زبان و ادب سے کیسی محبت تھی۔ یہ ان کے ادبی اور لسانی ذوق کا آئینہ دار بن گیا ہے۔

اس مجموعہ میں سے کچھ مضامین کے اقتباسات اور کچھ کا پورا متن اس انتخاب میں ہے جو ہمارے ناظرین کے ہاتھوں میں اس وقت ہے۔ حضرت مولانا سید سلیمان ندوی کے طرزِ تحریر کی نمایاں خوبی یہ ہے کہ جیسا موضوع ہوتا ہے ویسا ہی اندازِ بیان اختیار کرتے۔ ہر حال میں اپنی زبان کی فصاحت و بلاغت کو برقرار رکھتے۔ جس میں ان کے اسلوب کی استواری اور ہمواری بھی برقرار رہتی۔ اپنے دعوے کو مؤثر اور باوقار دلائل سے ثابت کرتے۔ مؤرخانہ تجزیہ اور محققانہ تجسس کرنا ان کا فطری ذوق تھا۔ اسی لیے اپنی تحریروں میں نتائج کا استنباط بڑی احتیاط سے کرتے۔ جن میں صرف کام کی باتیں ہوتیں۔ وہ اچھے خطیب بھی تھے اس لیے اپنی تحریروں میں خطیبانہ انداز سے بھی اپنے ناظرین کو متاثر کرنے کی کوشش کرتے تاکہ اگر موضوع خشک ہو تو اس کی خشکی سے ناظرین گھبرا نہ جائیں۔

ان کی تنقید نگاری میں قلم کی محض ترنگ نہیں ہوتی، لفظی گرم بازاری کا تماشا بھی نہیں ہوتا۔ جھوٹے نگوں کی ملمع کاری بھی نہیں ہوتی، بلکہ اس میں ان کے علم، دانش، بصیرت اور قیمتی ورثے کی پوری عکاسی ہوتی ہے۔ اس میں ادبی فن دکھائی دیتا ہے جو مادّی اشیار کی تحلیل میں ایک ماہر کیمیاگر دکھاتا ہے۔

انھوں نے اپنی مذہبی تاریخی اور علمی تصانیف اور مضامین میں جس قدر بیان کا حسنِ اظہار کیا ہے اس سے نہ صرف بزمِ شبلی کے صدر الصدور قرار دیے گئے، بلکہ اردو زبان کے معماروں میں بھی شمار کیے جاتے رہے۔

ان کے اسلوب کی یہ چند خصوصیات جو بہت مختصر طریقے پر ابھی بیان ہوئیں ان کی ان تحریروں سے بھی ظاہر ہوں گی جو اس انتخاب میں ہیں۔ اس میں اردو زبان کی تاسیس کا جو تجزیہ ہے اس میں کہنگی کے بجائے ابھی تک تازگی ہے، گو اس کے لکھے ہوئے نصف صدی کا عرصہ گزر چکا ہے۔ "پرانے لفظوں کی نئی تحقیق" اور "تہنید" میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے بہت کچھ سیکھا جا سکتا ہے۔ اس میں ان کے طرزِ بیان میں شوخی اور رنگینی بھی آگئی ہے، جن سے ان کی خشکی جاتی رہی ہے۔ لکھنؤ کے ادیبوں اور شاعروں کے کارناموں کو پڑھ کر نہ صرف لکھنؤ والے بلکہ اور جگہوں کے لوگ بھی لطف اندوز ہوں گے۔ اکبرؔ کے ظریفانہ کلام کے تبصرے میں جس باریک بینی اور دقیقہ سنجی کی نشاندہی ہوئی ہے اس سے آج کے نقاد بھی ہر طرح سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ ہندوستان کی تاریخ لکھنے میں جو ہدایت اس انتخاب کے ذریعہ ملتی ہے وہ آج کے مؤرخین کے لیے ایک مفید درس ہے۔

ہم اتر پردیش اردو اکاڈمی اور خصوصاً اس کے چیرمین جناب مفتی رضا انصاری صاحب کے ممنون ہیں کہ اس انتخاب کو شائع کر کے حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کی ادبی، لسانی اور علمی خدمات کو پھر سے لوگوں کے سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔

سید صباح الدین عبدالرحمٰن
دارالمصنفین شبلی اکیڈمی (اعظم گڑھ)
۲۲ر اپریل ۱۹۸۵ء

ہندوستان میں ہندوستانی

آج کل بعض دوستوں نے پنجاب میں اردو اور دکن میں اردو لکھا ہے اور ایک عزیز نے گجرات میں اردو لکھنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس لیے ضرورت تھی کہ غریب ہندوستان میں اردو کی داستان بھی کچھ سنائی جائے۔ خدا کے فضل سے اس میدان میں صوبہ متحدہ، پنجاب اور دکن کے علمائے ادب نے اتنی تحقیقات کی ہے، کہ "آب حیات" کا قصہ اب افسانہ ہو کر رہ گیا ہے

ہندوستان جیسا کہ اس وقت کی تاریخوں سے ظاہر ہے، سیکڑوں چھوٹی بڑی ریاستوں اور مملکتوں میں بٹا ہوا تھا۔ سلطان غزنوی کے فتوحات کے عہد میں اس ملک میں دو اسلامی ریاستیں قائم تھیں، ایک ملتان میں دوسری منصورہ (یعنی بھکر واقع سندھ) میں، ان کے علاوہ صوبہ سرحد میں شاہی حکومت تھی، جس کا پایۂ تخت ویہند تھا، کشمیر، اجمیر، دہلی، قنوج، مگدھ (بہار) بنگال، گجرات، مالوہ، بہت سی ریاستیں تھیں جو ایک دوسرے سے باہم دست و گریباں رہتی تھیں، مسلمانوں نے آکر ان ملکوں کو ایک ملک اور ان ریاستوں کو ایک سلطنت بنایا، جس میں پشاور سے لے کر صورت تک ایک حکومت قائم ہو گئی تھی۔

ہندوستان میں زبانوں کی کثرت

زبان کے لحاظ سے اس میں بھانت بھانت کی بولیاں تھیں، اور ہیں، چنانچہ پیمائش لسانی کے محققین کے نزدیک اس میں آج بھی تین سو سے زیادہ بولیاں مروج ہیں

اس مقالے سے اقتباسات جو ۱۹۳۳ء میں انجمن اردوئے معلی مسلم یونیورسٹی علی گڈھ میں پڑھا گیا۔

ان بولیوں کو چھوڑ کر یہاں کی صرف ممتاز زبانوں کو لیا جائے، تو بھی یہ تعداد دہائی سے کم نہ ہوگی۔

مسلمانوں نے جب سے اس ملک میں قدم رکھا، وہ یہاں کی زبانوں اور بولیوں کی کثرت کے شاکی نظر آئے، سنہ ۲۷۰ھ (سنہ ۸۸۳ء میں جبکہ سندھ کی اسلامی عربی حکومت پر پونے دو سو برس گذر چکے تھے، منصورہ (واقع سندھ) میں ایک ایسا عراقی مسلمان شاعر تھا جو ہندوستان کی مختلف زبانوں سے واقف تھا، اور اس نے الرا (الور سندھ) کے راجہ کی فرمائش سے قرآن کا ترجمہ ہندی (شاید سندھ کی کسی بولی) میں کیا تھا[1]، مسعودی جو سنہ ۳۰۳ھ سنہ ۹۱۵ء میں ہندوستان آیا تھا، ہندوستان کی ملکی اور لسانی پریشان حالی کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتا ہے۔

> "بعد ازیں ہند کے لوگوں کے خیالات مختلف ہوگئے اور مختلف گروہ پیدا ہوگئے؛ اور ہر رئیس نے اپنی ریاست الگ کرلی، تو سندھ پر ایک راجہ بنا، اور قنوج پر دوسرا، اور کشمیر میں تیسرا اور مانگیر پر جو بڑا علاقہ ہے (گجرات، کاٹھیاواڑ) بلہرا (دلبھ رائے) کی حکومت ہوئی...... اور ان ریاستوں میں باہم اختلاف ہیں"[2]

یہی مؤرخ آگے چل کر لکھتا ہے:

> "اور سندھ کی زبان ہندوستان سے الگ ہے"........ اور مانگیر (یعنی گجرات) کی زبان گیری ہے اور اس کے ساحلی شہروں جیسے چیمور، سوبارہ اور تھانہ (بمبئی) کی زبان لاڑی ہے"[3]

ابن ندیم بغدادی جس نے اپنی الفہرست سنہ ۳۷۷ھ سنہ ۹۸۷ء میں ترتیب دی ہے، ہند کی نسبت لکھتا ہے:

> "یہ لوگ مختلف زبانوں اور مختلف مذہبوں والے ہیں اور ان کے لکھنے

---

[1] عجائب الہند بزرگ بن شہریار ص ۳ پیرس

[2] مروج الذہب مسعودی جلد اوّل ص ۱۶۲ پیرس

[3] ایضاً ص ۳۸۱

کے خط بھی کئی ہیں، ایک شخص نے جو اس ملک میں خوب گھوما پھرا تھا، بتایا ہے کہ وہاں دو خط مستعمل ہیں[1]۔"

ابوریحان بیرونی نے جو سلطان محمود غزنوی کا معاصر تھا، اور جس نے ہندوستان میں سالہا سال رہ کر یہاں کے علوم و فنون اور زبانوں کو سیکھا تھا، ایک موقع پر ہندوستان کے رسم خطوں کے سلسلہ میں لکھا ہے:

> "ہندی خط بائیں طرف سے چلتا ہے، ان کے مشہور رسم خط کا نام سدّھ ماترک ہے، جو کشمیر کی طرف عموماً منسوب ہے اور یہی بنارس میں جاری ہے، اور یہی مدھیہ پردیش یعنی صوبہ متوسط میں جو قنوج کے اطراف کا نام ہے، جس کو آریہ ورت کہتے ہیں، چلتا ہے۔ مالوہ کے حدود میں ایک خط جاری ہے جس کو ناگر کہتے ہیں اور اسی کے بعد اردھناگری خط ہے، یعنی آدھا ناگر اور دوسرے خطوں سے ملا جلا ہے۔ اور یہ بھارتیہ اور کچھ (سندھ) میں مروج ہے، اس کے بعد ملواری خط ہے، جو ملوشا یعنی جنوبی سندھ میں رائج ہے، اور کنڑی کرناٹک میں، اور انتری (آندھری) انتر (آندھر) میں اور دراوڑی دراوڑ دیش میں اور لاری لار دیش (گجرات، کاٹھیاواڑ) میں اور گوڑی (بنگالی) پورب دیش میں اور بیکشک اودنپور میں اور یہ بوبول کا خط ہے۔" (ص ۴۴)

رسم خط کے اختلاف سے ہر صوبہ کی زبانوں کا اختلاف بھی ظاہر ہوتا ہے۔

یہ تو عربوں کے بیانات تھے، اب فارسی والوں کے لیجیے، امیر خسرو نے جو ساتویں صدی ہجری کے آخر اور آٹھویں صدی کے شروع میں تھے (یعنی تیرھویں صدی عیسوی کے آخر اور چودھویں صدی عیسوی کے شروع میں) اپنی مثنوی "نہ سپہر" میں ہندوستان کے مختلف صوبوں کی حسب ذیل بولیاں گنائی ہیں:۔

سندھی، لاہوری، کشمیری، بنگالی، گوری (واقع بنگال) گجراتی، تلنگی، معبری، (کنڑی) دھور سمندری (کارومنڈل) اودھی، اور دہلوی۔

امیر خسرو کے تین سو برس کے بعد اکبر کے زمانہ میں بھی یہی بولیاں تھیں، ابوالفضل

---

[1] کتاب الفہرست مصر ص ۲۴

آئین اکبری میں ان زبانوں کے نام یہ گناتا ہے:

دہلوی، بنگالی، ملتانی، مارواڑی، گجراتی، تلنگی، مرہٹی، کرناٹکی، سندھی، افغانی شالی (جو سندھ، کابل اور قندھار کے بیچ میں ہے) بلوچستانی، کشمیری، یہ زبانیں آج بھی موجود اور بولی جاتی ہیں، صرف ایک بمبئی کے احاطہ میں گجراتی، مرہٹی، کچھی، کنڑی، اردو، سندھی، چھ زبانیں رائج ہیں، مدراس میں اڑیا، تامل، تلنگو، ملیالم اور اردو پانچ زبانوں کا رواج ہے، ایک حیدرآباد کی ریاست میں مرہٹی، کنڑی، تامل، تلنگی اور اردو پانچ زبانیں ایک ساتھ ہیں۔ بہار و اڑیسہ میں اڑیا، اردو، ہندی، ترہتی اور بھوجپوری بولیاں ہیں پنجاب میں پنجابی اور اردو کا میل ہے اور صوبہ سرحد میں پشتو، پنجابی اور اردو تین زبانیں دوش بدوش ہیں۔

ابھی حال میں مہامہوپادھیائے گوری شنکر ہیرا چند اوجھا نے "قرون وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب" کے عنوان سے چند خطبے دیے ہیں جن کو ہندوستانی اکیڈمی نے اردو میں ترجمہ کر کے شائع کیا ہے، فاضل موصوف نے اپنی دوسری تقریر کے خاتمہ میں سنسکرت کے بعد یہاں کی پراکرت زبانوں کا کچھ حال بیان کیا ہے اور ان کی حسب ذیل چھ قسمیں بتائی ہیں، ماگدھی، شورسینی، مہاراشٹری، پیشاچی، اذشنک اور آپ

ماگدھی

مگدھ اور اس کے قرب و جوار کے عوام کی زبان تھی۔ قدیم ماگدھی اشوک کتبوں میں ملتی ہے، عام طور پر سنسکرت کے ناٹکوں کے چھوٹے ملازم مثلاً دھیور، سپاہی، بدیسی، جین سادھو اور بچوں سے اسی زبان میں باتیں کرائی جاتی ہیں۔

شورسینی

شورسین یا متھرا کے قرب و جوار کے علاقہ کی زبان تھی، سنسکرت ناٹکوں میں عورتوں اور مسخروں کی بات چیت میں اس کا استعمال اکثر کیا گیا ہے۔

مہاراشٹری

مہاراشٹر یعنی مرہٹہ کی زبان۔ اس کا استعمال بالخصوص پراکرت زبان کی شاعرانہ تصانیف کے لیے کیا جاتا تھا۔

پیشاچی

پیشاچی زبان کشمیر اور ہندوستان کے مغربی و شمالی حصوں کی زبان تھی۔

اونٹک

اونٹی یعنی مالوہ کی عام زبان تھی، یہ زبان اجین اور مندسور میں رائج تھی۔

اپ بھرنش

اس زبان کا رواج گجرات، مارواڑ، جنوبی پنجاب، راجپوتانہ، اجین اور مندسور وغیرہ مقامات میں تھا۔ دراصل یہ کوئی زبان نہ تھی، بلکہ ماگدھی وغیرہ مختلف پراکرت بھاشاؤں کی بگڑی ہوئی مخلوط بھاشا کا نام ہے، راجپوتانہ، مالوہ، کاٹھیاواڑ اور کچھ وغیرہ مقامات کے بھاتوں کے ڈنگل بھاشا کے گیت ہی بھاشا کی بگڑی ہوئی صورت میں ہیں قدیم ہندی بھی بیشتر اسی بھاشا سے نکلی ہے۔

جنوبی ہند کی بھاشائیں ان کے علاوہ ہیں:

ٹامل

جنوبی ہند کی زبانوں میں سب سے قدیم اور فائق ٹامل ہے، اس زبان کا نشوونما زیادہ تر جینیوں کے ہاتھوں ہوا، اس کا رسم الخط سب سے الگ ہے۔

ملیالم

کی زبان ہے، مگر اس میں سنسکرت الفاظ بکثرت مل گئے ہیں۔

کنڑی

اس زبان کے ادبیات کی پرورش و پرداخت بھی جینیوں نے کی۔

تیلنگو

آندھرا صوبہ میں مروج ہے۔

مسلمانوں کی آمد اور زبانوں کی تشکیل

تفصیلِ بالا ایک ہندو فاضل کی تصنیف سے ماخوذ ہے۔ ان حوالوں سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ مسلمانوں کی آمد سے پہلے اس ملک میں بیسوں زبانیں مروج تھیں، جو زیادہ تر مختلف صوبوں، مختلف قوموں اور مختلف دھرموں کے زیر سایہ اپنی ہستی برقرار رکھے ہوئے تھیں۔ مسلمانوں نے جب اس ملک میں قدم رکھا، تو اس ملک کی زبانوں کی نیرنگی اور

بھاشاؤں کی کثرت کو دیکھ کر متحیر رہ گئے۔ جیسے جیسے ان کا قدم اندرون ملک میں آگے بڑھتا گیا، ان کی حیرت میں اضافہ ہوتا گیا۔ وہ قدرتی طور پر اپنے ساتھ اپنی زبان بھی لائے تھے، عرب عربی، ایرانی فارسی اور ترک و مغل ترکی، مگر ان سب پر فارسی اثر غالب تھا سندھ کے حکمراں گو عرب تھے، مگر ایران کے قرب اور فارسی تاجروں اور جہازرانوں کی آمدورفت کے سبب سے عربی آمیز فارسی کی ہر جگہ کثرت تھی، اور ادھر درۂ خیبر سے جو قومیں آئیں، ان کی مادری زبان کچھ بھی ہو، مگر ان کی سلطنت کی شاہی اور دفتری زبان فارسی ہی تھی، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا، کہ ہندوستان کی شاہی و سرکاری زبان فارسی ہی رہی۔

دیسی زبانوں میں مسلمانی لفظوں کا میل

لیکن ملکی بول چال اور عام زبانوں کے لئے نہ تو یہ ممکن تھا کہ ہندوستان کے کسی ایک صوبہ کی زبان کو اختیار کر کے اس کو پورے ملک پر محیط کر دیا جائے، اس لئے قدرتی طور سے یہ ہوا کہ مسلمان جس صوبہ میں گئے، وہاں کی صوبہ دار زبان اختیار کی، ساتھ ہی مذہبی، سیاسی، تمدنی، صنعتی، تجارتی، اور علمی ضرورتوں سے اپنی زبان کے سیکڑوں ہزاروں الفاظ اسی طرح اس ملک کی زبان میں مجبوراً بڑھائے، جیسے آج ہم انگریزی کے الفاظ و اصطلاحات اختیار کرنے پر مجبور ہیں۔

مذہبی مصطلحات، اللہ، ایمان، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، دعا، خیرات، صدقات رسول، پیغمبر، وحی، کتاب الٰہی، دوزخ، بہشت وغیرہ بے شمار الفاظ ہیں، جن کے بعد ہندوستان کی ہر ملکی بولی میں وہ اضافہ پر مجبور ہوئے۔ اسی طرح بادشاہ، وزیر، میر عدل، صدر جہاں، مقطع دار، صوبہ دار، سپہ سالار، قاضی وغیرہ سیکڑوں سیاسی اصطلاحات تھے۔ جو ان کی سلطنت کے روزمرہ میں جاری تھے، وہ ہندوستان کی ان مختلف ملکی بولیوں میں بھی جاری ہو گئے۔ آجکل کی زمینداری میں خواہ وہ ہندوؤں کی ہو یا مسلمانوں کی، جس قدر عہدے اور مالی اصطلاحات ہیں، وہ عموماً عربی، فارسی آمیزش، مثلاً دیوان، نائب، تحصیل دار، ضلع دار، کارندہ، گماشتہ، سیاہہ نویس، تحویل دار، واصل باقی نویس، خزانچی، متصدی، پیشکار، سررشتہ دار، محافظ دفتر، محرر وغیرہ۔ اب اصطلاحات کو لیجیے۔ واصل باقی، جمع بندی، مالگذاری، جمع خرچ،

گوشوارہ، فرد، بند، روزنامچہ، یادداشت، خلاصہ، کیفیت،

وغیرہ۔ یہ الفاظ نہ صرف اردو اور سادہ ہندی میں بلکہ گجراتی، مرہٹی اور بنگالی زبانوں میں بھی بعینہ یا اس کے دوسرے مرادف مستعمل ہیں، مرہٹی بولنے والے مرہٹے اپنے وزیروں کو پیشوا اور عام ہندو ریاستیں اُن کو آج تک دیوان کہتے ہیں، اور یہ دونوں فارسی ہیں، اسی طرح مرہٹی، گجراتی اور بنگالی میں معاملہ مقدمہ کے اکثر الفاظ اور اصطلاحات عربی یا فارسی ہیں۔ ہم اپنے صوبہ کے دیہاتی کسانوں کے سردار کو چودھری کہتے ہیں، لیکن مہاراشٹر میں اسی کا نام مقدم ہے، کلرک کے لیے آپ محرر بولتے ہیں، مگر وہاں اس کو کارکن کہتے ہیں۔

زراعت ہندوستان کا پیشہ تھا، مسلمانوں نے آکر اس پیشہ کو فن کی حیثیت سے جو ترقی دی، اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، مختصراً اتنا کہنا ہے کہ کابل، ترکستان اور ایران کے بیسوں میوے اور پھل وہ ہندوستان لائے، اور ان کے ساتھ ساتھ ان کے نام بھی آئے اور یہ سارے ہندوستان میں ہر بولی بولنے والوں کی زبانوں پر بعینہ چڑھ گئے، انگور، انار، سیب، بہی، انجیر، نارنجی، خربزہ، بادام، منقی، کشمش، پستہ، شفتالو، ناشپاتی، آلوچہ، خوبانی، چلغوزہ، فندق کے مزوں سے اہل ہند ایسے مانوس ہوئے کہ ان پھلوں کے ساتھ ساتھ ان کے ناموں سے بھی اپنی زبان کو نئی لذت بخشی، پھولوں کے بہت سے اقسام مسلمان ہندوستان لائے مثلاً گلاب، سوسن، سنبل، ریحان، بنفشہ، خطمی، نرگس، نسرین، نسترن، گل (گولڈمہر) گل شبو (گل شب بو) گل مخمل وغیرہ۔ آج یہ واقعہ تعجب سے سنا جائے گا، کہ تغلقوں کے زمانہ میں دہلی اور اس کے نواح میں بارہ سو باغ تھے، جن میں نو قسم کے انگور تھے

(تاریخ فیروز شاہی)

میووں کی تمہید سے مسلمانوں کے دسترخوان کے الوان نعمت یاد آئے۔ خشکہ، پلاؤ، قبولی، بریانی، زردہ، شیر برنج، قورمہ، قلیہ، شوربا، کباب، یخنی، دم پخت، کوفتہ، مزعفر، مطنجن، حلوا وغیرہ مسلمانوں نے پیش کیا۔ اور پورے ملک کے کام و دہن نے ان کے ناموں سے لذت پائی۔ ٹھنڈک کے لئے شربت، فالودہ، اور برف کا آبخورہ سامنے رکھا، ہندوستان نے ایک روٹی کو کبھی نان بنایا، کبھی

شیرمال، کبھی آبی، اور کبھی باقرخانی اور کبھی روغنی، اور کبھی چپاتی، اور کبھی کاک، اور کبھی کلچہ، مٹھائی ہندوستان کی چیز ہے مگر صورت اور مادے کے ساتھ ناموں کا تنوع اسلامی تہذیب نے بخشا، یہاں تک مٹھائی بنانے والے کے لیے عربی نام "حلوائی" یہاں برہمن کی پاک اور پوتر زبان کو بھی چھو لیتا ہے۔ اور حلوائی کے خوانچہ پر بالوشاہی جس کی اصل شاید والا شاہی ہو، قلاقند یا برفی، شکرپارے، نمک پارے، خرمے، نقل، گلاب جامن، حبشی، زعفرانی وغیرہ ملیں گے۔

کپڑوں کی نئی نئی صنعت کاریوں کی ایجادات کے ساتھ ان کے ناموں کو بھی ہندوستان کی زبانوں نے فروغ دیا، مخمل، قاقم، کاشانی، استبرق، زربفت طاس، مقیس، شروانی، مشجر، کمخواب، دیبا، اطلس، تافتہ، بافتہ، مشروع، زری، گلبدن، تن زیب، شال باف، جامہ دار، محمودی، علی قلی خانی، زرتار، چارخانہ، جامدانی، کامدانی، برہنہ تن ہندوستان کو ان کپڑوں کی بدولت کرتہ، اچکن، چکن، پشواز، میرزائی، نیم آستین، جامہ، عبا، قبا، چوغہ، فرغل، کلاہ، دستار، کلغی، شال، دوشالہ، چادر، پوستین، شلوار، پاجامہ، ازار، توشک، لحاف، فرش، قالین، مسند، بستر، رضائی، دولائی، تکیہ، غلاف، چادر، رومال، مندیل، موزے، ازاربند، کمربند کے نام عربی، فارسی اور ترکی سے آئے۔ پان ہندوستان کی چیز تھی، مگر اس کے لئے پاندان، خاصدان اور اگالدان اسلامی تہذیب نے پیش کئے۔

کھانا کس ملک میں پکایا اور کھایا نہیں جاتا، مگر ہندوستان کی قناعت پسند طبیعت مٹی کی ہانڈیوں اور کیلے کے پتوں سے آگے نہیں بڑھی، مسلمان آئے تو دیگ، دیگچی، کفگیر، چمچہ، رکابی، پیالہ، بادیہ، قاب، دسترخوان، آفتابہ، آبخورہ، سیلابچی، صابون، خلال، بکاول، باورچی، رکابدار، خانساماں اپنے ساتھ لائے، مسلمان جب یہاں آئے تو سر شام یہاں دیا اور دیپک جلتا پایا، انھوں نے بر سر محفل شمع جلائی، قندیل روشن کی اور جابجا فانوس، دیوارگیر، لالہ، مردنگ، اور فتیلہ سوز رکھے، اور ان سے مشعلچی نے مشعل جلا کر راستہ کو پرنور کیا، ہندوستان ہمیشہ سے گرم ملک تھا، مگر شورہ لگا کر اور پہاڑوں سے برف منگا کر گرمی میں پانی کو ٹھنڈا مسلمانوں نے کیا، اور چق، چلمن اور پردے لٹکا کر کمروں کو محفوظ کیا، اور

ہندوستان ہی کی ایک گھاس کو خس کہہ کر پکارا اور اس کی ٹٹیاں بنوا کر کھڑی کیں۔[1]

گھوڑے کی سواری کہاں نہ تھی، مگر جب مسلمان یہاں آئے تو لگام، زین، تنگ خوگیر، رکاب، نعل، نکتہ، جل، جس کی خرابی جھول ہے۔ سئیس، سوار، شہ سوار، تازیانہ، بھی سب اپنے ساتھ لائے۔

جواہرات میں درِ عمانی، عقیق۔ یمنی، لعل بدخشانی، زمرد، زبرجد، یشب فیروزہ، سنگ ستارہ سب ان کے لائے ہوئے ہیں۔ تعمیری پتھروں میں سنگ مرمر سنگ سرخ، سنگ سماق، سنگ لرزاں، سنگ خارا سب ان کے نکالے ہوئے ہیں زیوروں میں سرپیچ، مرزا بے پردہ، کلغی، طرہ، کانوں میں درہ، گوشوارے، ہاتھوں میں دست بند، جہاں گیری، بازو بند، نگے، جوشن، پری بند۔ گلے میں ہیکل، طوق، تعویذ گلوبند، زنجیر، کمر میں کمر زیب اور پاؤں میں پازیب یہ ان بیسیوں نام کو چھوڑ کر ہے، جو ہندی میں وضع کیے گئے۔

خوشبوؤں میں عطر ان کی ایجاد ہے اور خود عطر اس کے بیسیوں ہندی، فارسی، اور عربی نام ان کے وضع کیے اور وہی ملک کی ہر زبان میں پھیلے ہوئے ہیں۔

ان مثالوں سے مقصود یہ ہے، کہ مسلمانوں نے جب یہاں قدم رکھا تو اپنے پورے تمدن و معاشرت، سازوسامان اور اپنی اصطلاحات و ایجادات کو ساتھ لے کر یہاں وارد ہوئے۔ اور ان سب کے نام، اصطلاحات اور الفاظ بھی اپنے ساتھ لائے، اور چونکہ یہ ہندوستان میں بالکل نئی چیزیں تھیں، اس لیے ہندوستان کی بولیوں میں ان کے مرادفات کی تلاش بیکار تھی اور وہی الفاظ ہندوستان میں رائج ہو گئے۔

زبان کی ترتیب کے تین عناصر

زبان کی ترکیب تین چیزوں سے ہوتی ہے۔ اسم، فعل اور حرف۔ مسلمانوں نے یہاں آکر جو زبان اختیار کی اس کے تمام فعل اور حروف ہندوستانیوں کی بولیوں کے اختیار کیے۔ البتہ آدھے اسماء جن میں بڑا حصہ نئی چیزوں اور نئے ناموں کا تھا، وہ اپنی زبان سے لائے۔ بقیہ اسماء بھی ہندوستان ہی کے ہیں، ایسی حالت میں ہندو مسلمانوں کے مسلمہ اصول

---

[1] اس کی تفصیلات بابر کی تزک میں ملیں گی۔

تقسیم حقوق تہائی فی صدی سے زیادہ قبضہ تو مسلمانوں کا اس زبان پر نہیں، پھر کیا یہ ظلم نہیں کہ اس سے بھی دست بردار ہونے پر ہم کو مجبور کیا جاتا ہے۔

سندھ کی وادی ہماری متحدہ زبان کا پہلا گہوارہ

گذر چکا ہے کہ ہندوستان کے ہر صوبہ میں الگ الگ بولی تھی، مسلمان سب سے پہلے سندھ میں پہنچتے ہیں، اس لئے قرین قیاس یہی ہے کہ جس کو ہم آج اردو کہتے ہیں، اس کا ہیولا اسی وادی سندھ میں تیار ہوا ہوگا، عربی و فارسی بولنے والے مسلمان تاجر عراق بندر ابلہ، سیراف اور بصرہ سے نکل کر، سندھ کے بندروں سے گذر کر، گجرات ہو کر، بحر ہند کے کنارے کنارے سفر کرتے تھے، آخر پہلی صدی ہجری کے آخر یعنی ساتویں صدی عیسوی میں عرب مسلمانوں نے سندھ پر قبضہ کر لیا۔ یہ اسلامی لشکر شیراز و عراق سے مرتب ہو کر گیا تھا جس کے یہ معنی ہیں کہ اس لشکر کے لوگ فارسی اور عربی بولتے تھے۔ اس کے بعد جو سوداگر اور تاجر یہاں آ کر بود و باش اختیار کرنے لگے تھے، وہ بھی عربی اور فارسی بولتے تھے، جہازرانوں کی زبان بھی عربی و فارسی سے مرکب تھی، خود سندھیوں کی آمد و رفت بھی عراق میں لگی رہتی تھی، خصوصاً جب سنہ ۱۳۲ھ ۷۵۰ء میں خلافت کا مرکز شام سے عراق کو منتقل ہو گیا اور سندھ کے پنڈت بغداد جا کر اپنی زبان سے عربی کتابوں کے ترجمہ میں مدد دینے اور وہاں کے مختلف علمی و طبی منصوبوں پر سرفراز ہونے لگے، اس زمانے میں عربی میں ہندی کے بہت سے اصطلاحی لفظ اور دواؤں اور خوشبوؤں کے نام داخل ہوئے مثلاً بیڑہ جس کی عربی شکل بارجہ ہے، پلنگ جس کی عربی صورت بلنجہ ہے، جہاز کے خوابگاہ کے معنوں میں عرب ملاحوں نے اس کو استعمال کیا ہے۔ اسی طرح خوشبوؤں میں صندل (چندن) کافور (کپور) قرنفل (کرن پھول) عود قماری (راس قماری کا عود) وغیرہ لفظ ہیں، دواؤں میں سب سے عجیب نام مجھے "تبسط" معلوم ہوتا ہے، جس کو خوارزمی نے جو سلطان محمود کا معاصر تھا، مفاتیح العلوم میں نقل کیا ہے، جو ہمارے بھارت کی خرابی ہے، جو مریضوں کی غذا تجویز کی گئی تھی، پھلوں میں امبج (آنب) آم اور لیموں ہیں، جن کا ذکر سنہ ۳۰۲ھ ۹۱۵ء میں

مسعودی نے کیا ہے[1]۔ سندھ اور ملتان میں مسلمانوں کی ریاستیں تین سو برس تک قائم رہیں اور آخر سلطان محمود المتوفی سنہ ۴۲۱ھ سنہ ۱۰۳۰ء کے ہاتھوں ان دونوں ریاستوں کا خاتمہ ہوا۔ ان ریاستوں کا مذہبی تعلق بغداد اور مصر سے تھا اور خراسان، عراق، یمن، ایران اور مصر سے یہاں آنے والے تاجروں اور مسافروں کی برابر آمد و رفت لگی رہتی تھی۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہونا چاہئے، کہ سندھ اور ملتان میں دیسی بولیوں کے ساتھ عربی و فارسی کا میل جول بڑھتا رہے، اور ایک نئی مرکب بولی کا ہیولی تیار ہو، خوش قسمتی سے اس وقت ہمارے پاس بعض ایسی شہادتیں موجود ہیں، جن سے کچھ نہ کچھ اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔ بزرگ بن شہریار ملاح جو سنہ ۳۰۰ھ سنہ ۹۱۲ء میں بحر ہند کے سواحل سے گزرتا تھا، اس نے اپنے بحری سفرنامہ میں جس کا نام عجائب الہند ہے کئی ہندی الفاظ استعمال کئے ہیں، وہ سنہ ۲۷۰ھ سنہ ۸۸۳ء کا ایک قصہ ہم کو سناتا ہے، شہر الور واقع سندھ کے ایک ہندو راجہ نے منصورہ واقع سندھ کے مسلمان بادشاہ سے ایک ایسے مسلمان عالم کی درخواست کی جو اس کی زبان میں اسلام کی خوبیاں بتا سکے۔ بادشاہ نے ایک ایسے عراقی عالم کا انتخاب کیا جو ہندوستان کی بہت سی بولیاں جانتا تھا، چنانچہ وہ گیا اور سب سے پہلے راجہ کی خدمت میں اپنا ہندی قصیدہ پیش کیا اور پھر قرآن کا ترجمہ کیا۔ بغداد کا سیاح سنہ ۳۴۰ھ سنہ ۹۵۱ء میں سلطان محمود سے تقریباً ساٹھ برس پہلے سندھ اور ملتان آیا تھا۔ وہ کہتا ہے:

> منصورہ (یعنی موجودہ بھکر واقع سندھ) اور ملتان اور ان کے اطراف کی زبان عربی اور سندھی ہے اور مکران والوں کی زبان فارسی اور مکرانی ہے۔
>
> (ص ،، طبع لائیڈن)

اس کے بعد بغداد کا دوسرا سیاح ابن حوقل بھی جس کی سندھ اور ملتان میں سیاحت کا زمانہ سنہ ۳۵۸ھ سنہ ۹۶۸ء ہے، یہی کہتا ہے کہ:

> منصورہ (بھکر) اور ملتان اور اس کے اطراف میں عربی اور سندھی بولی جاتی ہے
>
> (سفرنامہ ابن حوقل ص ۲۳۲ لائیڈن)

---

[1] اب ہمارے فاضل دوست ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب نے اورینٹل کالج میگزین مئی سنہ ۱۹۴۳ء میں قدیم عربی تصانیف میں ہندوستانی الفاظ پر مضمون شائع کیا ہے۔

اس کے چند سال کے بعد سنہ ۳۰۵ھ ۹۶۶ء میں بشاری مقدسی ملتان آیا، وہ لکھتا ہے:

"اور یہاں فارسی زبان سمجھی جاتی ہے"۔ (سفر نامہ بشاری ص ۴۸۱ لائیڈن)

پھر دیبل یعنی ٹھٹھ واقع سندھ کے حال میں کہتا ہے:

(ٹھٹھ، سمندر کے ساحل پر ہے، اس کے چاروں طرف سو گاؤں کے قریب ہیں، اکثر غیر مسلم ہندو ہیں، سمندر کا پانی شہر کی دیواروں سے آکر ٹکراتا ہے یہ سب سوداگر ہیں، ان کی زبان سندھی اور عربی ہے۔ (ایضاً ص ۹،۴)

ان معاصرانہ شہادتوں کی بنا پر ماننا پڑے گا کہ عربی و فارسی الفاظ کا میل جول ہندوستان کے جس حصہ میں پہلے واقع ہوا وہ سندھ ہے، جس کی حد اس زمانہ میں ایران، ترکستان اور خراسان سے ہندوستان آنے کا راستہ براہ راست ملتان ہو کر تھا، چنانچہ سلطان محمود غزنوی بھی اسی راستے سے ہندوستان آیا ہے، اس کا اثر یہ تھا کہ ان ملکوں سے علم وفن کے کامل اور شعر و ادب کے ماہر اسی راستے سے آکر ہندوستان کے جس شہر میں داخل ہوئے تھے وہ ملتان تھا، چنانچہ سلطان ناصر الدین قباچہ کے زمانہ تک جو سلطان التمش کا معاصر و حریف تھا، ملتان ہی اسلامی علوم و فنون کا مرکز اور اسلامی تعلیم کی درسگاہ تھا، اس کے بعد رفتہ رفتہ یہ مرکز ملتان سے لاہور کو اور پھر لاہور سے دہلی کو منتقل ہو گیا۔

اس تشریح سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ مسلمانوں کی عربی و فارسی سب سے پہلے ہندوستان کی جس دیسی زبان سے مخلوط ہو گئی، وہ سندھی اور ملتانی ہے پھر پنجابی اور بعد ازیں دہلوی، سندھی پر اس اختلاط کی شہادت آج بھی اسی طرح نمایاں ہے، چنانچہ ہماری اردو کی طرح سندھی بھی عربی فارسی الفاظ سے اسی طرح گراں بار ہے اور سب سے عجیب یہ کہ اس کا رسم الخط آج تک ٹھیٹھ عربی نسخ ہے اور عربی کے بہت سے خالص الفاظ مستعمل ہیں، مثلاً پہاڑ کو جبل اور پیاز کو بصل کہتے ہیں۔

سندھی، ملتانی اور پنجابی آپس میں بالکل ملتی جلتی ہیں، تینوں میں بہت سے فارسی الفاظ کا اشتراک ہے، تینوں میں عربی و فارسی کا میل ہے، صیغوں کے طریق میں تھوڑا تھوڑا فرق ہے، یہاں پر اس تاریخی غلط فہمی کا مٹانا ضروری ہے، جس کے رو سے عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ بولیاں موجودہ اردو کی بگڑی ہوئی شکلیں ہیں، بلکہ

واقعہ یہ ہے کہ موجودہ اردو ان ہی بولیوں کی ترقی یافتہ اور اصلاح شدہ شکل ہے، یعنی ہم جس کو اردو کہتے ہیں اس کا آغاز ان ہی بولیوں میں عربی و فارسی کے میل سے ہوا، اور آگے چل کر دار السلطنت دہلی کی بولی سے جس کو دہلوی کہتے ہیں مل کر معیاری زبان بن گئی اور پھر دار السلطنت کی بولی معیاری زبان بن کر تمام صوبوں میں پھیل گئی، علامہ بیرونی المتوفی سنہ ۴۴۰ھ سنہ ۱۰۴۸ء جس نے ہندوستان میں شاید ملتان اور سندھ میں رہ کر کتاب الہند کا مسالہ مہیا کیا ہے، اس نے اپنی کتاب میں جس لہجہ اور طرز ادا میں ہندی الفاظ لکھے ہیں، ان سے ماہرین ادب نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ وہ ملتانی اور سندھی شکل میں ہیں۔

غزنوی دور میں

بہرحال اب وہ زمانہ ہے جب غزنین میں آل سبکتگین کی حکومت قائم ہے، اور سبکتگین اور اس کے فرزند ہندوستان پر پے در پے حملے کرتے ہیں، ان حملہ آوروں کی مادری زبان ترکی مگر علمی و ادبی و سرکاری زبان فارسی تھی، سلطان محمود غزنوی المتوفی سنہ ۴۲۱ھ سنہ ۱۰۳۰ء نے گو گجرات تک دھاوا کیا، مگر اس کی سلطنت بالآخر پنجاب و سندھ میں سمٹ کر رہ گئی، جہاں تقریباً دو سو برس تک وہ قائم رہی۔ اس میل جول کا اثر یہ ہوا کہ ترکستان، ایران اور کابل کے ہزاروں لاکھوں آدمی ہندوستان آ کر بس گئے، اور ہزاروں ہندوستانی ان ملکوں میں جا پہنچے اور ہندی غلاموں اور کنیزوں کی گھر گھر فراوانی ہوئی[1]۔ غزنیوں کی فوج میں بہت سے ہندو افراد سپاہی نوکر تھے اور وہ حدود سلطنت میں موقع بموقع بھیجے جاتے تھے۔

سلطان محمود کے دربار میں ہندی کا مترجم تلک نام کا ایک ہندو تھا جس کی تعلیم و تربیت کشمیر میں ہوئی تھی، اور اصفہان جا کر اس نے فارسی سیکھی تھی، سلطان مسعود کے زمانہ میں جو سنہ ۴۲۱ھ سنہ ۱۰۳۰ء میں تخت پر بیٹھا تھا، اس عہدے پر ایک ہندو بیربل نام سرفراز تھا، سلطان محمود کے دربار میں جہاں عرب و عجم کے ادبا رہتے تھے، فضلائے ہند بھی ان کے پہلو بہ پہلو تھے، کالنجر کے راجہ انندا نے سنہ ۴۱۳ھ سنہ ۱۰۲۲ء میں ہندی میں

---

[1] علاوہ تاریخوں کے دیکھو قاموس نامہ "بندہ خریدن"

بادشاہ کے لئے مدحیہ شعر لکھے:

آنند ابزبان ہندی در مدح سلطان شعرے گفتہ نزد او فرستاد سلطان آنرا بفضلائے ہند وعرب وعجم کہ در ملازمت او بودند نمود ہمہ تحسین و آفریں کردند۔

(تاریخ فرشتہ)

آنند انے ہندی زبان میں سلطان محمود غزنوی کی تعریف میں اشعار کہہ کر بھیجے تھے، سلطان نے یہ اشعار ہند عرب اور عجم کے ان فاضلوں کو دکھائے، جو اس کے یہاں ملازم تھے سب ہی نے ان کی تعریف وتحسین کی۔ (تاریخ فرشتہ)

اس اختلاط اور میل جول کا قدرتی اثر یہ ہوا کہ اہل ولایت کی زبانوں پر فارسی الفاظ چڑھ گئے، چنانچہ یہی سبب ہے کہ غزنوی عہد کے بعض ان شعراء کی زبانوں سے بھی ہندی الفاظ ادا ہوئے ہیں، جنھوں نے ہندوستان کا منہ بھی نہیں دیکھا تھا، حکیم سنائی غزنوی (سنہ ۴۶۴ھ ؍ ۱۰۷۱ء تا سنہ ۵۴۵ھ ؍ ۱۱۵۰ء) جو بہرام شاہ غزنوی کے معاصر تھے، اپنے ایک قصیدے میں زبانوں کے اختلاف کو غیر اہم بتا کر فرماتے ہیں[۱]

تو بے مرگ ہرگز بجائے نیابی　　زشک نعتہائے ایں و آنی !
اسامی دریں عالم است ارنہ حاشا　　چہ آب وچہ ناں وچہ میدہ چہ پانی !

عہد غزنوی کا مشہور شاعر مسعود سعد سلمان جو خاص لاہور میں پیدا ہوا تھا، اس کی نسبت عوفی اور امیر خسرو نے لکھا ہے، کہ وہ عربی وفارسی کے علاوہ ہندی کا بھی شاعر تھا، اور اس زبان میں اپنا ایک دیوان بھی یادگار چھوڑا۔ اس کے دیوان میں ایک شعر کا دوسرا مصرع ہے[۲]

برآمد ازیں دیوار حصن مارا مار

ان شعروں میں "پانی" اور "مارا مار" اور شاید "میدہ"[۳] ہندی لفظ ہیں، جو اہل ولایت

---

[۱] کلیات سنائی بمبئی ص ۹۶

[۲] بحوالہ پنجاب میں اردو ص ۹۶

[۳] لفظ میدہ فارسی لغات میں گو ملتا ہے (موید الفضلاء) مگر خیال ہوتا ہے کہ یہ ہندی کا ہے، کیونکہ یہاں شاعر نے آب اور پانی کو جس طرح بالمقابل استعمال کیا ہے ویسے ہی نان اور میدہ کو بالمقابل شاید رکھا ہے بطور لف ونشر غیر مرتب۔

کی زبانوں پر چڑھ گئے اب ساتویں صدی ہجری کے آغاز میں غوریوں کا دور شروع ہوا جنھوں نے بہت جلد لاہور اور ملتان سے آگے بڑھ کر اصل ہندوستان پر قبضہ کیا ۔ اور دہلی کو اپنا پایۂ تخت بنایا ۔ اب اس مشترک زبان کا قدم اور آگے بڑھا ۔ ان کی حکومت پشاور سے گجرات اور بنگال تک قائم ہوگئی اور اس پورے ملک میں جہاں کہیں بھی بول چال کی ایک زبان نہ تھی ایک مشترک زبان کا ہیولیٰ تیار ہوگیا ۔ قاضی سراج منہاج جو سنہ ۶۲۴ھ ۱۲۲۶ء میں سندھ اور ملتان کی راہ سے ہندوستان آئے تھے ۔ اپنی تاریخ میں کوچ بہار اور اس کے قرب و نواح کے فتوحات کے سلسلہ میں لکھتے ہیں :

" واین را زبان دیگر است میان لغت ہند و تبت ۔ "	کوچ بہار اور اس کے گرد و نواح کے باشندوں کی جداگانہ زبان ہے جو ہندوستان اور تبت
(ص ۱۵۲ کلکتہ)	کے بیچ کی زبان ہے ۔

اس سے معلوم ہوا کہ ہندوستان کی ایک زبان پنجاب سے لے کر بنگال تک پیدا ہو چلی تھی ، جس کے برخلاف وہاں کی زبان ہندوستانی زبان اور تبت کی زبان کے بیچ میں تھی ۔

یہیں پر خلیج فارس اور بحر ہند کے ذکر میں وہ لکھتے ہیں :

" آب گویند چوں بدریائے ہندوستان درآید و در لغت ہندوی سمندر گویند " (ص ۱۵۲ طبقات ناصری ، منہاج کلکتہ)

دہلی کے سب سے پہلے سلطان قطب الدین ایبک کو رعایا نے اس کے جود و کرم کے صلہ میں " لک بخش " کا خطاب دیا تھا ۔ (فرشتہ جلد اول ص ۶۳) یعنی لاکھوں کا دینے والا اس کے زمانہ کی تعریف اہل ہند " کال قطب الدین " کہتے تھے ، " و کال زمانہ را گویند ۔ (فرشتہ جلد اول ص ۶۳ نولکشور) اس عہد کے سکوں پر بادشاہ کے نام کے ساتھ " شری امیر " لکھا ملتا ہے ، شری کا لفظ آج بھی ہندوؤں میں شری مہراج کی ترکیب میں مستعمل ہے مگر اس وقت کی اس ترکیب " شری امیر " پر ذرا غور کیجیے

ملتان سے دہلی

شمس الدین التمش نے اپنے خواجہ تاش لیکن حریف ناصر الدین قباچہ کو سنہ ۶۱۵ھ سنہ ۱۲۱۸ء میں شکست دے کر ملتان اور سندھ کو بھی دہلی سے ملا لیا ، جس کا نتیجہ یہ ہوا

کہ ان اطراف کے بہت سے تاجر اور سوداگر دہلی آ گئے۔ بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ "ملتانیاں" کا لفظ اس زمانہ میں "سوداگران پارچہ" کے ہم معنی ہو گیا تھا[1]۔ اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ اب ملتان اور لاہور اور دہلی کی مشترکہ خدمات اس متحدہ زبان کے بنانے میں شامل ہو گئی تھیں۔ اس کی سند میں ایک بزرگ ہستی کا نام لینا ہے جن کی پیدائش اور تعلیم و تربیت تو ملتان اور سندھ میں ہوئی، مگر روحانی اکتساب فیض دہلی میں فرمایا اور آخری سکونت اور دائمی آسودگی لاہور کی مملکت میں اختیار فرمائی۔ یعنی حضرت بابا فرید شکر گنج رحمۃ اللہ علیہ

ہندوستان کے روحانی فاتح

جن لوگوں کو ہندوستان کی سیاسی تاریخ کے ساتھ ساتھ یہاں کی روحانی تاریخ کا مطالعہ کا موقع لا ہے وہ یہ تسلیم کریں گے کہ ہندوستان میں غزنیں اور غور کے سلاطین ملکی فتوحات کے لئے جہاں جہاں بڑھتے جاتے تھے ان سے پہلے یہ روحانی سلاطین اپنے روحانی فتوحات کے لئے آگے بڑھتے جاتے تھے۔ ان سے پہلے یہ روحانی سلاطین اپنے غزنی اور غور کے بادشاہوں نے فتح کیا ہے تو اس سے زیادہ یہ کہنا درست ہے کہ ہندوستان کی روح کو خوانوادہ چشت کے روحانی سلاطین نے فتح کیا۔ یہ ایک خود مستقل موضوع ہے اور کبھی فرصت سے یہ بڑی داستان بھی سننے کے لائق ہے۔

یہ روحانی فاتح عوام سے ملتے ہیں

ہندوستان میں کسی ایک متحدہ زبان کی ضرورت جتنی سلطنت کو ہوتی تھی، اس سے کہیں زیادہ عوام کو اور ان سے زیادہ صوفیوں کو جو ہر بولی کے انسانوں تک پہونچنا فرض سمجھتے تھے۔ اب تک اردو کی تاریخ میں اکبر اور شاہ جہاں اور ان کے مینا بازار اور اردوئے معلیٰ کو اہمیت دی گئی ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ ان سے کہیں زیادہ صوفیہ کو اہمیت حاصل ہے جن کو ہندوستان کے عوام کی زبان کو اختیار کرنے میں نہ سلطنت کے رعب داب کا خیال مانع آسکتا تھا، اور نہ علم ظاہر کے جبہ و دستار کے وقار کا۔ بلکہ عوام کی اصلاح اور حق کی تبلیغ کی خاطر ان کو ہندوستان کے عوام کی دیسی زبان کو قبول کرنے میں کوئی تامل نہ تھا۔

---

[1] دیکھو تاریخ فیروز شاہی۔

ٹھیک جس طرح مسلمانوں سے پہلے ہندوستان کے عوام کی زبان بودھ نے اپنے دھرم کے پرچار کے خاطر اختیار کیا اور اسی میں اپنا اپدیش دیا، اور جس طرح مسلمانوں کے بعد عیسائی پادریوں اور مشنریوں نے یہاں کے عوام کی بولیوں کو بے تامل استعمال کیا، اس طرح ان صوفیوں نے اس وقت کے عوام کی دیسی زبان کے بولنے میں پیش دستی کی۔

حضرات صوفیہ اور یہ نئی زبان

اس وقت تک اردو کے جتنے قدیم فقرے مل سکتے ہیں، وہ عموماً صوفیوں کے ملفوظات ہیں اور اردو کی پرانی تصنیفیں خواہ وہ دکھنی ہوں یا گجراتی وہ سب صوفیوں کی لکھی ہیں جس طرح ۱۸۵۷ء کے انقلاب سے کچھ پہلے دہلی کے علم و عرفان کے مشہور خانوادہ نے وقت کی اردو زبان کو جس کو اس وقت ہندی زبان کہتے ہیں اپنے اصلاحی رسالوں اور تصنیفوں اور قرآن و حدیث کے ترجموں کے لئے فارسی کے بجائے پسند کیا اور عوام تک پہونچنے کی خاطر اردو ہی کو جس میں اس وقت تک شمالی ہند میں لکھنا پڑھنا عیب سمجھا جاتا تھا۔ بے تکلف قبول کیا، اور اصلاح دین اور بدعات کا بڑا ذخیرہ اردو میں جمع کر دیا جس نے رفتہ رفتہ اہل علم سے اس نئی زبان میں لکھنے پڑھنے کا حجاب اٹھا دیا۔

خواجہ فرید شکر گنج ملتانی

خانوادۂ چشت کے فرد فرید، شکرستان معرفت کے مشہور گنج شکر سے کون واقف نہیں، حضرت خواجہ فرید گنج شکر کا خاندان اگرچہ کابل کا تھا مگر شہاب الدین غوری کے زمانہ میں ملتان آکر بس گیا تھا۔ اور خواجہ کی ولادت یہیں قصبہ کھتی وال مضافات ملتان میں ۵۸۴ھ ۱۱۸۹ء میں ہوئی، خواجہ کی نشو ونما اور ان کی تعلیم و تربیت ملتان میں ہوئی اٹھارہ برس کی عمر تھی۔ ملتان کے مدرسہ میں مولانا منہاج الدین ترمذی سے فقہ میں کتاب نافع کا درس لے رہے تھے کہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کا گذر ہوا اور ایک ہی نظر کیمیا اثر نے ان کو کہاں سے کہاں پہونچا دیا، بہر حال ملتان سے نکل کر قندھار اور دوسرے ممالک سے اخذ فیض کے بعد پھر اپنے وطن واپس آئے اور بعد کو اپنے پیر کے حضور میں دلی آئے اور یہاں سے پنجاب کے شہر اجودھن میں جا کر اقامت اختیار کی اور وہیں

سنہ ٦٧٠ھ سنہ ١٢٧١ء میں آسودۂ خاک ہوئے۔

اس وقت تک اس زبان کی ابتدائی تاریخ کا جہاں تک پتہ لگ سکا ہے، اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ شیریں دہن جس کے منہ سے مصری کی یہ "ڈلیاں" پہلے نکلیں خواجہ فرید گنج شکر ہیں، چنانچہ ملفوظات اور تصوف کی کتابوں میں موصوف کے چند فقرے ملتے ہیں۔

۱۔ پہلا فقرہ وہ مکالمہ ہے جو حضرت خواجہ اور ان کے مرید شیخ جمال الدین ہانسوی کی بیوہ کے درمیان ہوا۔ خواجہ نے شیخ جمال الدین کے خورد سال بچہ برہان الدین کو ان کے باپ کی وفات کے بعد اپنے حلقۂ بیعت میں لے لیا۔ اس پر ان کی والدہ نے کہا: "خوجا برہان الدین بالا ہے"۔ خواجہ نے فرمایا: "پونوں کا چاند بالا ہوتا ہے"[1]۔ یہ "بالا" وہی لفظ ہے جو لڑکے بالے اور بچہ بالا کے ساتھ آج بھی بولا جاتا ہے۔

اب تک صوفیانہ ذکر اور مراقبہ میں عربی یا فارسی کے فقرے استعمال ہوتے تھے۔ خواجہ پہلے شخص ہیں۔ جنھوں نے ان کو ہندوستانی زبان میں ادا فرمایا۔ ہمارے کتب خانہ میں اوراد و تصوف کی دو قلمی کتابیں ہیں جن میں حضرت کے یہ فقرے مذکور ہیں۔ فرمایا[2]:

۲۔ در راستا گوئی۔ اوہی ہی ودر چپا بگوئی یہی ہی، در دل بگوئی ایہی ہی۔
دیگر بزبان ہندی

۳۔ در راستہ ہمہ توں۔ ودر چپا ہی توں ودر دل ہمہ توں۔

۴۔ دیگر گوید از طرف دل ہوں توں ودر آسماں توں ہوں۔ توں ہوں کی نسبت یہ کہا گیا ہے کہ یہ عربی فقرہ انا انت کا ترجمہ ہے۔

تصوف کے افکار کے ایک اور رسالہ میں جس کا نام "جواہر خمسہ" ہے اور جس کا سنہ ١٠١٦ھ سنہ ١٦٨٥ء کا لکھا ہوا نسخہ کتب خانہ دارالمصنفین میں ہے۔ اور جس کا "بندگی حضرت قطب الاقطاب حضرت شیخ فرید شکر گنج قدس اللہ سرہٗ ذکر

---

[1] سیر الاولیاء بحوالہ پنجاب میں اردو۔

[2] رسالہ شیخ بہاء الدین بن ابراہیم عطار القادری قلمی دارالمصنفین

بزبان ہندی وضع فرمودہ اند ادر عمل آوردہ اند، ہونہہ توں اہونہہ توں اینہیں توں سوئے آسمان نگریستہ بزبان گویدا ہونہہ توں..... باز روئے سوئے زمین کردہ بہمان عرق زبان گویدا ہونہہ توں..... بعدہٗ نظر و ابرو وارد، و بر خود گمارد، ریبا سر کرت یا ہفتہ کرت اینہیں توں:

شیخ اپنے ایک دوست کو "بھیا" کہا کرتے تھے[1] آپ سے پوچھا گیا، کہ ذہن کا مقام کہاں ہے؟ تو فرمایا "بیچ سر کے"[2]

کہتے ہیں کہ ایک دفعہ بابا فرید اپنی آنکھوں پر پٹی باندھے ہوئے تھے۔ ان کے پیر خواجہ قطب الدین بختیار کاکی نے سبب پوچھا تو بابا نے ہندی زبان میں جواب دیا "آنکھ آئی ہے" شیخ نے فرمایا۔ اگر آئی ہے "چرا بستہ اید"؟

سرسہ کے مقام پر بابا فرید ایک بزرگ کے مزار پر جایا کرتے تھے، کچھ لوگ ان کے راستہ میں چھپ کر بیٹھ گئے، جب آپ کو معلوم ہوا تو ناخوش ہوئے، اور ہندی میں فرمایا: سرسہ کبھی سرسہ، کبھی نرسہ[3]

ہمارے وطن (دیسنہ ضلع پٹنہ) میں اردو کا ایک کتبخانہ ہے اس میں چند پریشان اوراق کا ایک پرانا مجموعہ ہے جس میں کسی صاحب نے حضرت بابا فرید کے کچھ فارسی اقوال لکھے ہیں، اور ساتھ ہی ذیل میں ایک نظم بھی ہے؛

وقتِ سحر وقتِ مناجات ہے — خیز دراں وقت کہ برکات ہے
نفس مبادا کہ بگوید ترا..! — خسپ چہ خیزی کہ ابھی رات ہے
بادمِ خود ہمدم و ہشیار باش — صحبتِ اغیار بوری بات ہے
با تنِ تنہا چہ روی زیں زمین — نیک عمل کن کہ وہی ساتھ ہے
پند شکر گنج بدل و جان شنو — ضائع مکن عمر کہ ہیہات ہے

اس نظم کو اردو کے ایک مشہور مؤلف نے حضرت شکر گنج کی طرف منسوب کیا ہے

---

[1] تاریخ اردوئے قدیم بحوالہ سیر الاولیاء ص ۳

[2] ایضاً بحوالہ جواہر فریدی ص ۲۰۸

[3] پنجاب میں اردو بحوالہ جواہر فریدی

حالانکہ میرے خیال میں یہ حضرت کے فارسی اقوال کے جامع کی نظم ہے۔ نہ کہ خود حضرت کی ہے۔ اخیر شعر میں شکر گنج کے توصیفی لقب کو تخلص سمجھنا تعجب انگیز ہے، ظاہر ہے کہ خود حضرت اپنے آپ کو شکر گنج نہیں کہتے تھے۔ اتنا صحیح ہے کہ حضرت کی زبانِ مبارک سے بعض ہندی دوہے ادا ہوئے ہیں جن میں سب سے مقدم اور مستند وہ ہے جو میر خورد دہلوی نے سیر الاولیار میں نقل کیا ہے:

"ایں دوہرہ کہ بزبان مبارک حضرت شیخ شیوخ العالم فرید الحق والدین گذشتہ است مناسب ایں معنی است

گنت نہوتین کاری ناکان است منائے
بس کندے دھن گر ہو رین لبائے"[1]

بہر حال اس نظم سے قطع نظر کر کے   کے فقروں میں "کا اور کے اضافت کی علامت ہوتا ہے۔ اور "آئی ہے" فعل اور ہوں۔ توں اوہی یہی ضمیر اور اینہی اور ہوان اور بیچ ظرف اور بالا چند، آنکھ بھیا اسمار اس میں موجود ہیں۔

حضرت نظام الدین دہلوی

خواجہ فرید شکر گنج کے مرید حضرت نظام الدین سلطان الاولیار المتوفی سنہ ۷۲۵ھ سنہ ۱۳۲۵ء کے ملفوظات فوائد الفواد میں جس میں حضرت کے سنہ ۷۲۲ھ سنہ ۱۳۲۲ء تک کے ملفوظات امیر خسرو کے دوست امیر حسن دہلوی نے جمع کیے ہیں، حسب ذیل ہندوی الفاظ ان کی زبان مبارک سے بے تکلف ادا ہوئے ہیں، پیاز۔ (ص ۹) لنگوٹہ (ص ۹) کھٹ (یعنی کھاٹ ص ۱۵) کندوری (عرس ص ۵۵) پنجبہ (ص ۶۸) لنگھن (فاقہ ص ۸۶) دھاڑی (یعنی ڈاکو ص ۱۲۸) لٹ (ص ۱۶۳)

حضرت سلطان الاولیار کی زبان سے یہ شعر ادا ہوا ہے:

لنگمت گر کند ترا فربہ   سیر خوردن ترا ز لنگھن بہ[2]

---

[1] سیر الاولیار ص ۲۶۳

[2] فوائد الفواد ص ۸۶، یہ شعر حکیم سنائی کی حدیقہ (ص ۵۶۸) لکھنؤ میں بھی ہے۔

حضرت سلطان الاولیاء نے شیخ احمد والی کے ذکر میں فرمایا کہ شیخ احمد بہت خوش آواز تھے۔ "ولیا خوش گفتہ ہندوی می گفت" یعنی گایا کرتے تھے، جامع مسجد اجمیر کے امام، فقیہ مادھو (ذرا ایک ہندی عالم کے اس عالمانہ نام پر نظر رہے) نے ایک دفعہ ان کا ہندی گانا سن کر فرمایا: "چنیں آوازے کہ تو داری دریغ باشد کہ در سرود ہندوی خرچ کنی۔" شیخ احمد نے اسی وقت سے قرآن یاد کرنا شروع کر دیا۔

(ص ۱۸۴ مطبع اودھ اخبار)

شیخ نصیر الدین اودھی

شیخ نظام الدین اولیاء کے مرید شیخ نصیر الدین اودھی چراغ دہلی (المتوفی ۷۵۷ھ ۱۳۵۵ء نے جب اپنے ایک ساتھی شیخ اخی سراج کو بنگالہ رخصت کیا، تو انھوں نے عرض کی کہ اس مملکت پر تو شیخ علاء الدین تلے سرفراز ہیں۔ فرمایا "تم اوپر تلے"

خواجہ بندہ نواز دکنی

شیخ نصیر الدین دہلوی کے دوسرے ممتاز مرید حضرت خواجہ بندہ نواز ہیں، جو ۸۱۵ھ ۱۴۲۲ء میں وفات پائی۔ بہمنیوں کی سلطنت گلبرگہ میں آگئے اور یہیں ۸۲۵ھ ۱۴۲۲ء میں وفات پائی۔ ان کا ایک فقرہ ان کے ایک مرید نے یہ نقل کیا ہے: "بھوکوں موئے سوں خدا کچھ اپڑتیا ہے خدا کو ان اپڑنے کی استعداد ہور ہے"۔ ان کا پورا ہندی رسالہ معراج العاشقین چھپ چکا ہے۔

ان بزرگوں کے ان مسلسل فقروں کو سن کر اب اس میں شک کی کیا گنجائش رہ گئی ہے کہ اس زبان کی عمر جتنی سمجھی جاتی ہے اس سے کہیں زیادہ ہے، یہ حقیقت میں ہندوستان ہی کی زبان تھی جس کو ان بزرگوں نے قبول کی نظر سے دیکھا، اور محبت کی شکر میں گھولا۔

---

[۱] پنجاب میں اردو بحوالہ جواہر فریدی۔

[۲] تاریخ فرشتہ ۲ ص ۴۰۰ نول کشور۔

[۳] تاریخ اردوئے قدیم نول کشور ص ۲۳ بحوالہ عشق نامہ عبداللہ بن عبدالرحمن چشتی۔

خلجی اور تغلق دور میں

یہ تغلق اور خلجی سلاطین کا دور ہے۔ ان بادشاہوں کے زمانہ کی دو یادگار تاریخیں ہمارے سامنے ہیں۔ تاریخ فیروز شاہی ضیاے برنی اور تاریخ فیروز شاہی سراج عفیف۔ ان دونوں تاریخوں میں جن میں سے پہلی دہلی میں چھٹی صدی کے آخر اور ساتویں صدی ہجری کے اوائل میں اور دوسری ساتویں صدی کے بیچ میں تصنیف ہوئی ہے۔ بہت سے ہندی الفاظ اور مصطلحات ملتے ہیں اور جو آج تک اس مشترکہ ہندوستانی زبان کا سرمایہ ہیں۔

بجیرہ لکھہ (لاکھ) کہار (ص ۸۶۱) ٹھگ (۱۸۹) لونڈی (ص ۱۹۲) ٹیکہ ہنڈوال (ص ۲۲۰) منڈل (ص ۲۱۷) گھٹی (ص ۲۲۰) بہی ٹہواریاں (ص ۲۸۸) ڈھولک (ص ۵۷۴) چبوترہ (ص ۳۲۰) مٹھ (۳۴۴) بسوہ چرائی۔ ڈیہہ قصبات (ص ۲۸۸) منڈہ (منڈی غلہ) (ص ۳۰۴) ماش۔ ہوٹھ (۳۵۰) منڈلی (ص ۳۰۴ (ص ۳۱۰) ریوڑی (ص ۳۱۶) تھانہ (ص ۳۳۰) دھاوگان (جمع فارسی دھاوا بمعنی ڈاک دوڑیہ (۳۳۱) موڑہ (موڑھا ص ۳۷۳) چودھری (۳۸۸) بی بی (ص ۳۴۳) بھٹی (ص ۳۱۶) تاریخ فیروز شاہی برنی۔

بی بی (ص ۳۹) لک (لاکھ ص ۴۸) لکھوک (جمع لکھوک) (ص ۳۳۱)۔ چونہ پز (چونہ پکانے والا) راج (معمار) سوندھار (سونار ص ۳۳۱) بھیڑ بھتر (ص ۱۰۴) کنگرہ۔ کٹڑہ (ص ۳۷۱) چودھریان (ص ۳۷۰) لت (لات ص ۳۷۰) بھرکر (ص ۳۹۳) گھڑیال (ص ۳۴۴) گھڑیال خانہ (ص ۲۷۱) درخت سینبھل (ص ۳۱۱) چونہ (ص ۳۱۰)

(سراج عفیف)

تاتار خاں اعظم نے عورتوں کی پردہ سواری کے لئے گردونہا راست کنانیدہ بود کہ آں را بزبان ہندی "بھرکر" گویند" (۳۹۳ سراج عفیف) محمد تغلق کی زبان سے ایک دفعہ بے دینی کا فقرہ نکلتا ہے۔ مولانا عماد برسر دربار اس کے جواب میں کہتے ہیں: "گہ مخور" (اخبار الاخیار ص ۱۸۸) فیروز شاہ کے عہد میں سکندر حاکم بنگال ایک افسر ملک قبول سے پوچھتا ہے: "چہ نام داری"؟ ملک بزبان ہندی گفت:

"تورا باند" اب اس کو "تورا بندھو" سمجھیے یا "تورا بندہ"۔ (شمس سراج عفیف ص ۱۶۰)

سلطان محمد تغلق نے جب سندھ کے حملہ میں جان دی اور سلطان فیروز شاہ نے ناکام حملہ کے بعد سندھ چھوڑ کر گجرات کا رخ کیا تو سندھیوں نے کہا:

"برکت شیخ تھیا، ایک موا ایک تھا۔" (شمس سراج عفیف ص ۲۳۱)

امیر خسرو کا عہد

اب وہ زمانہ ہے جب کل ہندوستان ایک کے علم کے نیچے جمع ہو گیا تھا، اور ہندوستان کے اندر ایک متحدہ زبان کا پیکر تیار تھا، جس نے عوام کے بازاروں سے اہل علم کے حلقوں تک رسائی حاصل کر لی اور امیر خسرو المتوفی ۷۲۵ھ ۱۳۲۵ء جیسے ہمہ گیر سلطان ادب نے اس کی سرپرستی کی اور اس کو عربی و فارسی منظومات کے پہلو بہ پہلو جگہ دی، امیر کی فارسی مثنویوں اور تاریخی تصنیفوں میں بے شمار ہندی الفاظ استعمال ہیں۔ ان کی ہندی نظمیں جو پہیلیوں اور مکرنیوں کی صورت میں ہیں، بہت مشہور ہیں، گو اس وقت ہمارے پاس ان کی ان ہندی منظومات کا کوئی مستند حصہ نہیں ہے، تاہم انھوں نے اپنے دیوان غرۃ الکمال کے خاتمہ میں جو طویل فارسی نثر لکھی اس میں اپنی ہندی نظم پر خود فخر کیا ہے، فرماتے ہیں:

> پیش ازیں از بادشاہان سخن کسے را سہ دیوان نبود، مگر مرا خسرو ممالک کلام مسعود سعد سلمان را اگرچہ ہست اما آں سہ دیوان او عبارت است از عربی و فارسی و ہندی اما در پارسی مجرد کسے سخن را سہ قسم نکردہ جز من کہ دریں کار قسام عادلم ع
>
> قسمت چو چنیں بود چہ تدبیر کنم[1]

امیر خسرو کی اس عبارت کا یہ مطلب نہیں کہ انھوں نے بھی مسعود سعد کی طرح عربی و فارسی اور ہندی کے تین الگ الگ دیوان تیار کیے تھے۔ بلکہ وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ مسعود سعد سلمان نے تینوں زبان میں الگ الگ تین مستقل دیوان تیار کیے تھے اور میں نے ایک

---

[1] خاتمہ غرۃ الکمال امیر خسرو قلمی دار المصنفین۔

زبان فارسی میں ہندی اور عربی میں ملاکر ایک سخن کا سراپا تیار کیا۔

امیر کو اپنے ہندی کلام پر جو ناز تھا، وہ ان کے اس شعر سے نمایاں ہے، جس کو انھوں نے اپنی اسی کتاب کے خاتمہ میں لکھا ہے:

چو من طوطی ہندم ار راست پرسی   ز من ہندوی پرس تا نغز گویم

اسی خاتمہ میں ایہام کی ایک نئی صفت پیدا کرنے پر فخر کیا ہے:

بازایہامے دیگر بربست کردہ ام کہ یک طرف ہمہ ہندوی خیز می افتد
وجانب دیگر پارسی می خیزد

آہی آئی ہماں پیاری آہی   ماری[1] ماری سر آئی موری ماہی

امیر نے اپنی مثنوی نہ سپہر میں ہندوستان کی ایک فضیلت یہ بیان کی ہے کہ یہاں کے لوگ ہر ملک کی زبان بول سکتے ہیں، مگر بیرونی لوگ یہاں کی زبان نہیں بول سکتے۔ کہتے ہیں:

ہست دوم آن کہ زبند آدمیاں   جملہ بگویند زباں یا بہ بیاں
لیک از اقصائے دگر ہر کسے   گفت نیارد سخن ہند بسے
بست خطا و مغل و ترک و عرب   در سخن ہندوی ما دوختہ لب

غرض ہر جگہ وہ اپنی زبان کو ہندوی کہتے ہیں اور اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ہندوی اس وقت کے ہندوستان کے بول چال میں[2] تھی۔

شیخ شرف الدین یحییٰ منیری بہاری

حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیری (المتوفی ۷۸۲ھ ۱۳۸۰ء) جن کا وطن اور مسکن بہار ہے اور تعلیم و تربیت بنگال میں پائی تھی، اور بیعت دلی جاکر حاصل کی تھی ان کے بہت سے ہندوی دوہے ہیں جن میں بعض بیماریوں کی مجرب دوائیں بتائی گئی

---

[1] اس شعر کو میں پوری طرح سمجھ نہیں سکا۔

[2] نومبر ۱۹۲۹ء کے اورینٹل کالج میگزین میں امیر خسرو کی مختلف تصانیف سے ہندوستانی الفاظ تلاش کر کے لکھے گئے ہیں۔

ہیں ۔ مثلاً :

لودھ پھٹکری مرداسنگ   ہلدی زیرا ایک ایک ٹنگ
افیون چنا بھر مرچیں چار   اردبھر تھوتھا اس میں ڈار
پوست کے پانی پوٹلی کرے   نینا پیر ایل میں سرے

(شفاء الامراض حکیم محمدی دنیسوی مرحوم قلمی دیسنہ)

حضرت شیخ کے ملفوظات کا مجموعہ معدن المعانی کے نام سے ان کی زندگی ہی میں زین بدر عربی نے فارسی میں لکھ کر گذرائی تھی ۔ اس میں ایک موقع پر اردو کے دو فقرے استعمال ہوئے ہیں ، خواجہ جلال الدین حافظ ملتانی نے عرض کی :

بزبان ہندوی نیکو گفتہ است ہر کہ گفتہ است "باٹ بھلی بر سانہ کرے" ۔

حضرت شیخ نے اس کی تائید میں فرمایا :

بعد ازاں بندگی مخدوم عظمہ اللہ بر زبان مبارک راند ، دیس بھلا پر دور ۔

(معدن المعانی مطبوعہ شرف الاخبار بہار سنہ ۱۸۸۴ سنہ ۱۳۰۱ جلد اول ص ۲۰۳)

ہمارے وطن (دیسنہ ضلع پٹنہ) کے کتبخانۂ اصلاح میں ایک فالنامہ کے دو صفحے پرانے کاغذ کے ہیں جن میں اسی زبان میں مختلف اعداد کے جوابات بتائے گئے ہیں ، اور اس کے سرنامہ پر اس فالنامہ کی نسبت حضرت مخدوم کی طرف کی گئی ہے ، اس میں کل ستائیس فقرے ہیں ۔ جن میں سے بعض یہ ہیں :

۱۱۱ ۔ جو من کے نسی کیا ہوئی سو ہوئی ۔
۱۱۲ ۔ ناہیں کچھ کرو نصیب لاگی بات ہے ۔
۱۳۱ ۔ ابہیں ، ابھیں ناہیں ۔
۱۳۲ ۔ ابھیں ناہیں سوت رہو جائے ۔
۲۲۱ ۔ راج پاٹ اٹل کے دیا تم کون ۔
۲۲۲ ۔ آگے برے دن گئے اب سکھ پاوہگے ۔
۲۳۲ ۔ ابھیں ناہیں آگو ہو چکا ۔

لہ ان اشعار کو آزاد نے آب حیات میں امیر خسرو کی طرف منسوب کیا ہے ۔

۳۱۱۔ تورے دن کے اب سکھ سوچیا ناہیں۔

مخدوم اشرف کچھوچھوی اودھی

اسی طرح حضرت مخدوم اشرف جہانگیر سمنانی المتوفی ۷۹۸ھ ۱۳۹۵ء ہیں۔ انکا بڑا حصہ بنگال بہار اور اودھ میں بسر ہوا۔ اور کچھوچھہ ضلع فیض آباد میں مدفون ہوئے ان کے ملفوظات کے مشہور مجموعہ لطائف اشرفی میں الفاظ۔ دعائیں اور منتر اردو نما ہندی میں ملتے ہیں۔ اس کے مؤلف نظام حاجی غریب یمنی ہیں ۷۵۰ھ ۱۳۴۹ء میں ان کے مرید ہوئے تھے، اس مجموعہ میں ایک حکایت ہے کہ سید اشرف جہانگیر رحمۃ اللہ علیہ ردولی کے پاس سے گزرے، اسی کے قریب ایک گانوں میں مولانا کریم الدین دانشمند رہتے تھے، سید موصوف ان سے ملنے کے لئے چلے، کسی نے مولانا کو جاکر اطلاع دی۔ انھوں نے یہ خبر سن کر خاکساری کی راہ سے فرمایا "مثل ہندوی فرمودند" چھیری کے منہ کھنڈ اسمائے[1] چھیری مشرقی اضلاع کے دیہاتوں میں بکری کو کہتے ہیں، اور کھنڈ اجا دلوں کے چورا کو کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ بکری کو کھنڈ کھانے کو ملے۔ یہ اس کی عزت افزائی ہے۔ سید اشرف کی زبان سے اس میں سانپ اور بچھو کے کاٹے کے کئی منتر لکھے ہیں، جو نسخ وکتابت کی غلطیوں سے مسخ ہو گئے ہیں، بچھو کے کاٹنے کا ایک منتر صاف ہے "دھر بندھون۔ دھر کند ہول، سوالاکھ سپاری بندھول۔ اپنے بھگت گرد کے سکت ہوں یکہ جو آگیں (آگے) چڑھے۔

دوسرا: اینکی لکڑی۔ پانی پرائی، آنچس بندھول۔ نرلبس ائی مری یکہ جو اگین جائے۔

دوسرا: کالی کونی جنگل کے کاجل دھکا ناتھ پانچ چیز[2] الخ

شیخ علاء الدین بنگالی

شیخ علاء الدین لاہوری پنڈوی بنگالی المتوفی ۸۰۰ھ ۱۳۹۷ء اور شیخ نور الحق

---

[1] لطائف اشرفی ص ۳۸۴ نصرت المطابع دہلی [2] ایضاً ص ۳۹۶

پنڈوی بنگالی المتوفی سنہ ۸۱۳ھ سنہ ۱۴۱۰ء باپ بیٹے تھے۔ یہ تھے لاہوری مگر سکونت بنگال یا کر اختیار کی۔ شیخ نور الحق اپنے مکتوبات میں ایک فارسی شعر لکھ کر اس کے ہم معنی ہندی شعر لکھتے ہیں:

ہمہ شب بزاریم شد کہ صبا نداد بوے   ندمید صبح بختم چہ گنہ نہم صبا را
رین سب آئی سو یا سیج نلد ھا تھانوں   پیو نیو چھپے پاتری مجھ سہاگن نون ن

(ص قلمی دار المصنفین)

اسی زمانہ کے ایک اور بزرگ شیخ الاسلام سعد اللہ لکھنوی اور ان کے بیٹے شیخ امین الدین لکھنوی المتوفی سنہ ۸۲۹ھ سنہ ۱۴۲۶ء ہیں۔ یہ دونوں ہندی کے شاعر تھے ان کے مکتوبات میں ہندی الفاظ دوہے اور ہنڈولے ملتے ہیں، لکھتے ہیں:

"در شب روز تحریر جگرے بخیال گذشتہ نبشتہ شدہ است ذوق خواہد گرفت جگری ذکور انست، ہندوی

کون پراجت دیا کیتوں   شہ کل بانہہ نہ ائی کر سوتوں

عقدہ

جی ہوں سعد پیارے جینوں   سکھ دکھ پی کے بات کہیتوں ل
امین الدین مادھی جو دی پیو   شہ کے درشن داری جیو

عقدہ

مجھ برہا رین جگا دے!   رم تیں جال تبا دے!
جی ہوں نہیوں بھول کر نہیائے   جو بھنج تن [illegible] کانت کنیائے

مخدوم عبد الحق ردولوی

مخدوم شیخ عبد الحق دہلوی ردولوی المتوفی سنہ ۸۳۷ھ سنہ ۱۴۳۳ء کے ملفوظات میں بہتیرے فقرے ملتے ہیں۔ شیخ نے کچھ زمانہ سنام (پنجاب) میں بسر کیا تھا۔ فرماتے ہیں کہ وہاں ایک زاہدہ بی بی رہتی تھی، جو بڑی عبادت گذار تھیں۔ رات کو تہجد میں شیخ سے پہلے اٹھتیں اور

این فقیر را بہ لطف فرمودند بزبان ہندی بٹیا احمد آب گرم موجود است

نبایدکہ از آب سرد وضو کنی (۱۹)

شیخ کا ایک مرید شب و روز یہ چیختا تھا:

آہ شیخ احمد ماریو ماریو (ص ۱۰۰)

شیخ نے ایک مرتبہ یہ ہندی دوہرہ زبان مبارک سے ادا فرمایا:

کنوا ہو تو پاٹوں سمندر کہ پاٹن جائے
بارا ہو بر جوں جھل کر جن جائے

شیخ احمد عبد الحق ردولوی کے ملفوظات شیخ عبد القدوس گنگوہی المتوفی ۹۴۵ھ ۱۵۳۸ء نے جمع کیے ہیں۔ ردولی اور گنگوہ ہمارے صوبہ کے ابتدائی اور انتہائی کنارے کنارے کہے جا سکتے ہیں۔ اس مجموعہ میں حسب ذیل الفاظ نہایت بے تکلفی کے ساتھ استعمال کیے گئے ہیں۔ ہنڈولہ (ص ۳) پلنگ (ص ۳۸ اور اس سے بڑھ کر جھلنگہ چارپائی (ص ۴۰) چبوترہ (ص ۶۰) جنگل (ص ۶) کھچڑی (ص ۶۳) دھکا (ص ۷۲) گنوار (ص ۸۷) دب (دبالے سے (ص ۹۰) پالکی (ص ۹۵) دیپک (ص ۹۹) کندوری کھانا (ص ۱۰۰) مہاجن (ص ۱۲۳)

دکھنی اور گوجری وغیرہ

اب ہم اس زمانہ میں پہونچ گئے ہیں جب ہندوستان کی اس متحدہ زبان نے نظم کی زمین پر قبضہ کیا۔ شروع شروع میں یہ مذاقیہ اور تفریحی منظومات میں اسی طرح کام میں لائی گئی ہے۔ جیسے ہمارے عہد میں اکبر مرحوم نے انگریزی لفظوں اور جملوں کا استعمال اردو شعروں میں کیا۔ مگر یہ ظرافت۔ بہت جلد سنجیدگی میں بدل گئی۔ محمد تغلق نے ہندوستان و دکن کو ایک کر دیا۔ اور دولت آباد دکن کو اپنی حکومت کا دار السلطنت اور دلی اجاڑ کر اہل دلی کو دولت آباد میں لیجا کر بسایا۔ یہ پہلا دن تھا جس میں اس زبان کا تخم دکن کی سرزمین میں بویا گیا۔ یہاں کی آب و ہوا اس کو ایسی راس آئی۔ کہ تخم بڑھ کر پودا ہوا اور پودا ایک عظیم الشان درخت بن گیا۔ اور حیرت سے سنا جائے گا۔ کہ اس درخت نے شمال سے پہلے دکن میں پھل دیے۔ تصوف اور عوام کے مذہبی جذبات نے اس زبان کو اپنے فیوض سے مالا مال کرنا شروع کر دیا۔ جس کی بڑی وجہ

یہ ہوئی کہ دکن کے بہمنی بادشاہوں نے آٹھویں صدی ہجری میں دہلی سے الگ ہو کر گلبرگہ میں جب اپنی خود مختار حکومت قائم کی تو اپنا سرکاری دفتر فارسی کے بجائے ملک کی دیسی زبان میں رکھا، اس کے قدرتی نتیجے دو ہوئے۔ ایک تو یہ کہ برہمنوں نے سرکاری دفاتر میں جگہ پائی، اور دوسرا یہ کہ دیسی زبان نے ترقی شروع کی۔ بہمنی مٹ کر جب عادل شاہی و قطب شاہی وغیرہ پیدا ہوئے تو انھوں نے بھی اسی زبان کی سرپرستی کی۔ اور چونکہ شمالی ملک کے سلاطین کی طرح ان کے کابل و ایران سے تازہ تازہ تعلقات نہ تھے اور نہ وہ خود اجنبی نسل و وطن پر فخر کرتے تھے، اس لیے ان کے دربار کی زبان فارسی کے بجائے ہندوستانی ہو گئی تھی بلکہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہی ان کی مادری زبان تھی۔

ہندوستانی مسلمانوں کی مادری زبان

ابراہیم عادل شاہ (سنہ ۹۸۸ھ سنہ ۱۵۸۰ء - سنہ ۱۰۰۴ھ سنہ ۱۵۹۵ء) جو تخت نشینی کے وقت تک جاہل رہا تھا، اور پھر رفتہ رفتہ اس نے پڑھنا سیکھا اور فارسی پڑھی۔ اس کے حال میں اس کے معاصر مورخ فرشتہ نے لکھا ہے:

فارسی خواں گردید و بنوعے فارسی را خوب می گفت کہ تا ہندوستانی متکلم نمی شد ہیچ کس نمی توانست فہمید کہ غیر از فارسی بزبان دیگر آشنائی دارد۔ (ج ۲ ص ۸۰ نولکشور)

فارسی داں ہو گیا اور ایسی روانی سے فارسی بولتا کہ لوگ یہی سمجھتے کہ فارسی کے سوا دوسری کوئی زبان جانتا ہی نہیں ہے۔ مگر جب ہندوستانی زبان بولتا تو لوگوں کی غلط فہمی دور ہو جاتی۔

اس اہم فقرے سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں، ایک تو ہندوستانی زبان کا وجود اور دوسری یہ کہ ان بادشاہوں کی عام بول چال کی مادری زبان یہی ہندوستانی تھی، جس میں ان کے عہد کی تصانیف ملتی ہیں۔

موجودہ صوبہ جات متحدہ کی مادری زبان بھی اس عہد میں اسی قسم کی ہندوی یا ہندوستانی تھی۔ بدایوں جو مغلوں سے پہلے ایک مرکزی حیثیت رکھتا تھا۔ وہاں کے عبدالقادر بدایونی جنھوں نے سنہ ۱۰۰۴ھ سنہ ۱۵۹۵ء میں اپنی تاریخ لکھی ہے۔ اس وقت کے نود ۹۰ سالہ سنہ ۹۱۲ھ کی ولادت استاد شیخ عبداللہ بدایونی کا حال لکھتے ہیں کہ بچپن میں وہ استاد سے بوستاں پڑھ رہے تھے، شعر یہ آیا:-

محال است سعدی کہ راہِ صفا توان یافت جز از پے مصطفٰے

پرسید کہ معنی ایں بیت چیست، بزبان ہندی بیان کنید

...... چو معنی آں گفتہ ...... (ج ۳ ص ۵۴)

اس سے صاف ظاہر ہے کہ بچوں کی مادری زبان ہندوی ہو چکی تھی۔ اکبر کی زبان میں ملا بدایونی وغیرہ نے پنڈتوں کی مدد سے جس ہندی کی فارسی میں سنسکرت کتابوں کے ترجمے کیے تھے اس سے مراد یہی اس وقت کی اردو ہے۔ پنڈت سنسکرت سے اس وقت کی ہندوی میں اور ملا ہندوی سے فارسی میں ترجمہ کرتے تھے، ورنہ ظاہر ہے کہ ملانے ہندی جاننے کا کہیں دعویٰ نہیں کیا ہے

شیخ عبدالوہاب متقی جن کا وطن مالوہ تھا ۹۶۳ھ ۱۵۵۵ء میں ہجرت کر کے مکہ معظمہ چلے گئے تھے اور وہاں ممالک اسلامی کے طلبہ کو درس دیتے تھے۔ اس درس کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ ہر ملک کے طالب علموں سے ان ہی کی زبان میں تقریر فرماتے تھے، اس سلسلہ میں ہندیوں کو وہ ہندی میں پڑھاتے تھے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی جو ان کے شاگردِ خاص تھے۔ ان کے حال میں لکھتے ہیں:

وباہندیاں در تقریر فارسی تکلف نکنند وہم بزبان ہندی اکتفا فرمایند[1]	ہندوستانی طلبا کے لئے وہ فارسی زبان میں پڑھانے کی زحمت نہیں کرتے تھے بلکہ زبان ہندی پر اکتفا فرماتے۔

* * *

یہ واقعہ بھی اس دعوے کی شہادت ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی زبان ایک مدت سے ہندی ہو چکی تھی۔

شیخ عبدالوہاب متقی کے استاد شیخ علی متقی مشہور محدث ہیں ان کا آبائی وطن تو جونپور تھا لیکن پیدائش برہان پور میں ہوئی، اور ابتدائی ملازمت شاہان مالوہ کے ہاں منڈو میں کی، شیخ جن کے مرید اور ان کے لڑکے سے چشتی خرقہ پہنا، پھر ملتان جا کر شیخ حسام متقی کی صحبت اٹھائی، پھر ہندوستان سے ہجرت فرما کر مکہ معظمہ چلے گئے، کبھی بھی

---

[1] تاریخ اردوئے قدیم حکیم سید شمس الدین قادری نقلاً از زاد المتقین الی طریق سلوک الیقین شیخ عبدالحق دہلوی۔

سلاطین گجرات کے امرا سے احمد آباد گجرات آجاتے تھے ۹۷۵ھ ۱۵۶۷ء میں مکہ معظمہ میں وفات پائی۔ غور کیجیے کہ ان کا تعلق ہندوستان کے کن کن صوبوں سے رہا، جون پور (پورب) برہان پور (خاندیس) منڈو (مالوہ) ملتان (سندھ، پنجاب) اور احمد آباد (گجرات) بایں ہمہ جو ان کی زبان تھی وہ اس دوہرے سے ظاہر ہے جس کو انھوں نے اپنی موت سے کچھ دنوں پہلے مرض الموت کی حالت میں پڑھا تھا، فرمایا کہ کھانے کو بیس ڈالو

آں چناں بحق کن کہ ہمہ یکے شود دوئی نہ ماند. چنانچہ ایں دوہرہ خبری دہد دمی گوید[2]

سن سہیلی پریم کی باتا یوں مل رہی ہے جیوں دودھ بتاتا

دیکھیے کہ اردو کی پوری شان اس شعر میں موجود ہے۔

تاہم اس میں شک نہیں کہ جب تک شمالی ہند میں حکومت کا رعب وداب قائم رہا اس مادری زبان میں لکھنا پڑھنا اور تصنیف وتالیف معیوب بنی رہی اور اس کے برخلاف دکن اور گجرات میں خود صوفیہ نے اور شیعہ بادشاہوں نے پہل کی، صوفیہ نے اس زبان میں صوفیانہ رسالے لکھے اور بیجاپور اور گولکنڈہ کے بادشاہوں نے اس میں امام حسینؑ علیہ السلام کے مرثیے اور مناقب لکھے، اور رفتہ رفتہ شاعری کے دوسرے مضامین بھی بندھنے لگے اور اس طرح نثر کے ساتھ نظم نے بھی دکن اور گجرات میں ترتیب وتدوین کی عزت پہلے پائی۔

ہم سب کو انجمن ترقی اردو اور دکن کے بعض دوسرے اہل قلم کا ممنون ہونا چاہیے جنھوں نے اس عہد کی دکھنی نظم ونثر کی کتابوں کو حلیہ طبع آراستہ کرنا شروع دیا ہے یہ وہی ہندوستانی زبان ہے جس کو لوگ بعد میں دکھنی کے نام سے یاد کرنے لگے ہیں،

اس کے صوبہ وار نام

حقیقت یہ ہے کہ نئی قوم کے اختلاط اور میل جول نے ہر صوبہ کو متاثر کیا اور اس طرح نئی زبان کو بھی مقامی اور صوبہ وارانہ اثرات نے داخل ہو کر مختلف بولیوں میں

---

[1] برہان پور اب سی پی میں ہے۔

[2] اخبار الاخیار ص ۲۴۹ طبع ہاشمی میرٹھ۔

منقسم کر دیا۔ دکھنی، گوجری، دہلوی، لکھنوی، بہاری، پنجابی، ہر صوبہ کی ہندوستانی بولی میں علیحدہ علیحدہ کچھ کچھ امتیازات پیدا ہو گئے تھے اور اس لیے اس نئی زبان کا نام ہر جگہ الگ الگ پڑا۔ مثلاً دہلوی، دکھنی، گوجری، ہندی، ہندوی، یہ سب بتفاوت اسی ایک کے نام ہیں۔

اردو نام

تاہم یہ بات تعجب کے ساتھ یاد رکھنے کے لائق ہے کہ شروع سے لے کر اب تک اس زبان کا نام کہیں "اردو" سننے میں نہیں آیا۔ حالانکہ ہم نے آج اس نام کے سوا اس کے اور سب نام بھلا دیے ہیں۔ یہ تو سب کو معلوم ہے کہ اردو ترکی لفظ ہے جس کے معنی لشکر شاہی یعنی لشکر گاہ اور کیمپ کے ہیں اور اس معنی میں اس کا استعمال بہت قدیم ہے یہاں تک کہ تغلقوں کی تاریخ میں بھی یہ لفظ ان معنوں میں بولا گیا ہے۔ پھر تیموریوں اور خصوصاً شاہجہاں کے عہد میں "اردوئے معلیٰ" شاہی لشکر گاہ اور دہلی کے قلعہ معلیٰ کو کہنے لگے۔ مغلیہ سلطنت کے ساتھ ساتھ فارسی کا شاعرانہ تسلط بھی کمزور ہوتا جا رہا تھا اور اس نئی زبان کی طاقت روز بروز ابھر رہی تھی، عام بازاروں، گلیوں اور معمولی گھروں سے نکل کر شاہی دربار تک اس کا اثر پھیل رہا تھا۔ اس لیے شروع شروع میں اس کو لوگوں نے "زبان اردوئے معلیٰ" کا خطاب دیا۔ چنانچہ بارہویں صدی ہجری کے اواخر کی تصنیفات تذکرہ نکات الشعرا میر (ص ۱) اور ذکر میر (ص ۶۷) اور نوطرز مرصع مرقع رقم تحسین میں یہ نام یعنی "زبان اردوئے معلیٰ" کی لغوی اضافت کے ساتھ استعمال پاتا ہے۔

تیرھویں صدی ہجری کے اوائل سے کثرت استعمال کے سبب یہ اضافت جاتی رہتی ہے اور خود زبان کا نام اردو ہو جاتا ہے[1]۔ تذکرہ مخزن الغرائب میں جو ۱۲۱۸ھ کی تالیف ہے

---

[1] مزید تحقیق سے یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ اضافت کے بغیر یہ اردو نام بارہویں صدی ہجری کے اخیر ہی سے استعمال میں آ گیا تھا، پروفیسر شیرانی نے اس کے ثبوت میں مصحفی کا یہ شعر پیش کیا ہے

خدا رکھے زباں ہم نے سنی ہے میر مرزا کی   کہیں کس منہ سے ہم اے مصحفی اردو ہماری ہے

"خدا رکھے" سے ظاہر ہے کہ اس وقت میر و مرزا زندہ تھے اس لیے یہ شعر مصحفی نے ۱۱۹۵ھ سے پہلے کہا ہوگا۔ خواجہ میر درد کی شاگردی کے مدعی محشر کا بھی ایک شعر لکھا ہے (بقیہ حاشیہ اگلے ص پر)

مرزا مظہر جانِ جاناں کے حال میں ہے:

در زبانِ ہندی کہ مراد از اردو است حیلے فصیح و بلیغ بود

باغ و بہار وغیرہ فورٹ ولیم کالج کی تصنیفات میں یہ لفظ زبان کے معنوں میں عام طور سے بولا گیا ہے۔ ان حوالوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اردو زبان کے نام پر آج سے صرف ڈیڑھ سو برس پہلے کی ایجاد ہے۔

دہلی کے اردوئے معلی پر جب تباہی آئی، تو گو دہلی کے علم و ادب اور شعر و سخن کا خزانہ لٹ گیا، مگر اس کا اتنا فائدہ ہوا کہ جب استعداد حصہ رسدی کے مطابق تمام صوبوں میں جہاں چھوٹی چھوٹی نوابیاں قائم ہو گئی تھیں بزرگوں کا یہ اندوختہ سرمایہ بٹ گیا، اہل علم دہلی سے نکل کر پہلی منزل لکھنؤ میں، دوسری عظیم آباد میں اور تیسری مرشد آباد بنگال میں کرتے تھے، اور آخر میں ایک اور منزل فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں قائم ہوئی۔ بہت سے عزم و ارادہ والے ایسے بھی تھے جو دکن و ارکاٹ جا کر پناہ گزیں ہوئے اور اس طرح پورے ملک میں اردوئے معلی کی زبان نے اشاعت پائی

عدو شود سبب خیر گر خدا خواہد

یہ اس زبان کی مختصر تاریخ ہے جو آج ہماری ملکی اور قومی زبان ہے بلکہ جو آج اس پورے ملک کی واحد متحدہ زبان ہے۔

چونکہ مسلمانوں سے پہلے یہ ملک بہت سے حصوں میں بٹا ہوا تھا جن کی الگ الگ راجدھانیاں تھیں۔ اس لیے ان میں نہ کوئی ایک متحدہ زبان تھی اور نہ کسی متحدہ قومیت

بقیہ حاشیہ ص

گفتگو اردو زباں کی کوئی ہم سے سیکھ جائے
کیا ہوا دہلی میں محشر اپنی پیدائش نہیں

(اورینٹل کالج میگزین مئی سنہ ۱۹۲۱ء ص ۴۳ وحاشیہ ص ۶۲)

محشر سنہ ۱۲۰۶ء میں مارے گئے ہیں۔ (تذکرہ ہندی مصحفی ص ۲۴۴) مصحفی نے اپنے اس تذکرہ میں بھی جو مخزن الغرائب کے بعد سنہ ۱۲۲۱ء ۱۲۳۶ء کی تالیف ہے، نثار کے حال میں (ص ۲۵۵) زبانِ اردو لکھا ہے، مگر اس وقت یہ نام عام ہو چکا تھا۔

۲۔ "ختم مصحف" اس کی تاریخ ہے، جیسا کہ مصنف نے خاتمہ پر لکھا ہے جس سے سنہ ۱۲۱۸ء نکلتا ہے۔

کا وجود تھا اور نہ ایک متحدہ مملکت تھی۔ مسلمانوں نے آکر اس برِ اعظم کو ایک علم کے نیچے ایک مرکز کے ماتحت ایک ملک بنایا، جس کا نام پہلے ہند اور پھر ہندوستان رکھا اور ایک زبان پیدا کی، جس کا نام زبانِ ہند، لغتِ ہند، ہندوی ہندی، زبانِ ہندوستان اور ہندوستانی رکھا۔

ہندی لفظ

آج کل جس کو ہندی کہتے ہیں وہ پورب کی ایک صوبہ وار زبان ہے، جس کے لیے یہ کوشش کی جا رہی ہے کہ یہ پورے ملک کی زبان یا بولی ہو جائے، مگر حقیقت میں اس کا ایسا نام جس کی معنویت کے دائرے میں سارا ہندوستان داخل ہو جائے خود بدیسی ہے، پھر بھی اس کے لیے ایسا نام اختیار کرنا اس لیے مناسب ہے کہ اس سے سارے ملک کا خیال سامنے آتا ہے، ورنہ اگر اس کو برج بھاشا یا پوربی بھاشا کہہ دیا جائے تو یہ ملک کے ایک محدود جغرافی حصہ کے ساتھ خاص ہو جائے۔

اہلِ عرب یہاں کی قدیم زبانوں میں سے ہر ایک کو ہندی یا ہندیہ کہتے تھے وہ سنسکرت، پالی، ہندی، ملتانی، گجراتی سب کو ہندی ہی کہتے تھے، چنانچہ بزرگ بن شہریار کی روایت کے مطابق سنہ ۲۷۰ھ سنہ ۸۸۳ء میں جس زبان میں قرآن کا ترجمہ کیا گیا تھا اس کا نام مصنف نے "ہندیہ" بتایا ہے۔

اَنْ یُفَسِّرَ لَہٗ شَرِیعَۃَ الْاِسْلَامِ بِالْہِنْدِیَّۃِ (عجائب الہند ص ۳۰)	شریعت اسلام کا ہندی میں حال لکھے۔
ان یفسر لہ القرآن بالہندیہ۔ (عجائب الہند ص ۲۳)	قرآن کا ہندی میں مطلب بیان کرے۔

اسی طرح الفہرست میں جو سنہ ۳۷۷ھ سنہ ۹۸۷ء کی تصنیف ہے، ہندوستان کی جس زمین سے عربی طب کی کتابیں ترجمہ ہوئیں اس کے بیان میں ہندوستان کی زبان کا نام ہندی ہی رکھا گیا ہے۔

نقل من الہندی الی الفارسی (ص ۴۲۱) ہندی سے فارسی میں نقل ہوا۔

اس لیے مسلمانوں نے اپنی حکومت کے بعد اس زبان کو جس کو ہندوستان میں آکر

انھوں نے اختیار کیا، ہندی کا نام بخشا، انتہا یہ ہے کہ مولانا شاہ رفیع الدین صاحب دہلوی اور مولانا شاہ عبدالقادر صاحب دہلوی نے قرآن پاک کا جس زبان میں ترجمہ کیا اس کو بھی ہندی ہی فرمایا، اس سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ ہندی کی وسعت کہاں تک تھی اور اس میں ہندو اور مسلمان کا کوئی فرق نہ تھا، ایک ہی زبان تھی، جو پورے ملک میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک بولی اور سمجھی جاتی تھی۔

اردو اور ہندی کی تقسیم

لیکن انگریزوں نے دلی کے اردوئے معلی کو اجاڑ کر جب کلکتہ کے فورٹ ولیم میں اپنا نیا "اردوئے معلی" بنا کر کھڑا کیا تو ان کو اپنے ہم قوم عہدہ داروں اور تعلیمی اداروں کی خاطر ملکی زبان کی طرف بھی توجہ کرنی پڑی۔ مگر ساتھ ہی ساتھ ان کو یہ بھی معلوم تھا کہ ان کو ہندوستان میں حکومت کرنا ہے تو اس متحدہ قومیت کے درخت پر جو صدیوں کی لڑائیوں کے خون سے سینچ سینچ کر تیموریوں کے زیر سایہ تیار ہوئے تھے، پہلے کلہاڑی مارنا ضروری ہے۔ اس کے لیے ضرورت تھی کہ ہندو اور مسلمانوں کے امتیازات کے حدود کو جس قدر ممکن ہو گا ابھارا جائے۔ چنانچہ فورٹ ولیم میں اردو اور ہندی کے نام سے دو شعبے قائم ہوئے، ایک کو مسلمانوں کے سر تھوپا اور دوسرے کو ہندوؤں کے سر مڑھا اور اس کا نام علمی قدردانی اور ادب نوازی رکھا اور دونوں زبانوں میں کتابیں لکھوا لکھوا کر لوگوں میں تقسیم کی گئیں، یہ ہے آغاز اس انجام کا جو آج اردو اور ہندی کے مہابھارت کی صورت میں ملک میں قائم ہے۔

علی گڑھ تحریک کا حصہ اردو زبان کی ترقی میں

اس سے کس کو انکار ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں کی زندگی میں نئی تحریک اور نئے تعلیمی و ادبی انقلاب کی آواز اس درسگاہ کی چہار دیواری سے اٹھی۔ ایک مولوی محمد حسین آزاد کو چھوڑ کر جو ایک مستقل ادبی ریاست کے بانی ہیں باقی اردو کے تمام علم بردار اسی کی ہمہ گیر سلطنت سے وابستہ تھے، اردو زبان کو قصص و حکایات اور قصائد و غزلیات کے تنگ کوچہ سے علوم و فنون کی شاہراہ پر جو لایا وہ سرسید مرحوم ہی تھے۔ اردوئے معلی

اور عود ہندی والے غالب کے بعد جس نے عروس اردو کو سادگی کا گہنا پہنا کر تکلفات لاطائل کی گرانباری سے آزاد کیا وہ اسی درسگاہ کا بانی اول تھا۔ سرسید مرحوم کی اردو کی پہلی تصنیف آثار الصنادید سنہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ سے پہلے مسجع و مرصع عبارت میں لکھی گئی، مگر اس کا دوبارہ ایڈیشن صاف و رواں عبارت میں شائع ہوا۔

گو یہ سچ ہے کہ مولانا شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے ساتھیوں نے سرسید کیا بلکہ غالب سے بھی پہلے سادہ نگاری کا آغاز کیا، مگر وہ تحریک صرف مذہبی دائرہ میں سمٹ کر رہ گئی۔ اسی طرح حیدرآباد میں نواب شمس الامراء بہادر نے جدید علوم میں ستہ شمسیہ نام اردو رسالے تصنیف کیے، اور دہلی کالج کے ماسٹر رام چندر نے پولیٹکل کے ترجمے کیے، مگر یہ افراد کی محدود کوششیں تھیں۔

سرسید نے سنہ ۱۸۶۳ء میں سائنٹفک سوسائٹی کے نام سے باقاعدہ ایک علمی انجمن اس غرض سے قائم کی کہ علوم و فنون کی نئی نئی کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کر کے شائع کی جائیں، آج جو مسلم یونیورسٹی پریس ہے اس کی بنیاد اول اسی سائنٹفک سوسائٹی کا پریس ہے جو پہلے سرسید کا ذاتی پریس تھا، اس سوسائٹی کی طرف سے چالیس کتابیں چھوٹی بڑی تاریخ اور سائنس کی چھپ کر شائع ہوئیں۔

سرسید نے اپنی کشش اتصال سے علم و ادب کے لیے متعدد ستاروں کو اپنے گرد جمع کر لیا تھا، جن میں سے ہر ایک بجائے خود ایک نظام شمسی تھا، مولانا الطاف حسین حالی، مولانا نذیر احمد، مولانا شبلی، نواب محسن الملک، نواب وقار الملک اور بہت سے اہل قلم جمع ہو گئے، جنھوں نے اپنی کوششوں سے اس بولی کو زبان کا درجہ دیدیا اور ہر قسم کی ادائے مطلب کا اہل بنا دیا۔

علی گڈھ کی درسگاہ کو اس زبان کی ترقی کی تاریخ میں بہت سے اولیات حاصل ہیں۔

۱۔ اور یہ پہلا ادارہ ہے جس نے سب سے پہلی دفعہ اس زبان کے لیے علمی و ادبی ذخیرہ فراہم کیا۔

۲۔ یہ پہلا ادارہ ہے جس کے احاطہ میں اس زبان کے مسلم و مستند مصنف اور اہل قلم پیدا ہوئے۔

۳۔ یہ پہلا ادارہ ہے جس نے سب سے پہلی دفعہ اس زبان کے معیاری ذخیرہ کو اہل نظر اور شائقین کے لیے فراہم کیا۔” علی گڈھ کالج بک ڈپو آج سے تیس برس پہلے اس زبان کا واحد ذخیرہ گاہ تھا، جہاں سے کم از کم ایک ہزار ماہوار کی کتابیں فروخت ہوتی تھیں۔

۴۔ اور سب سے آخر یہ ہے کہ یہ پہلا ادارہ ہے جس نے دہلی اور لکھنؤ اہل زبان اور زبان داں اور شہری اور قصباتی کی دیرینہ جنگ کا خاتمہ کیا، اور جس طرح زبان خود ایک مشترکہ زبان کی حقیقت کی مدعی ہے، اسی طرح علی گڈھ نے اس کو مشترکہ ہندوستان کی ادبیت کا خزینہ دار بنا دیا، اور دہلی و لکھنؤ کے پرانے پیدائشی دعووں کو مٹا کر اہلیت و استعداد کی شرط کے مطابق حقیقی فضل و کمال کو زباں دانی کا معیار قرار دیا، اور ادبیات کی ایک آزاد ہندوستانی حکومت قائم کی، جس میں ہر صوبہ کے ہر شہر کے اہل قلم اور اہل علم برابر کے شریک ٹھہرے۔ سر سید دتی کے تھے، محسن الملک اٹاوہ کے، مولانا حالی پانی پت کے، مولانا نذیر احمد بجنور کے، مولانا شبلی اعظم گڈھ کے، مگر ان سب کی تصنیفات نے مل کر اس زبان کا ایک متحدہ معیار مقرر کر دیا، سر سید مرحوم نے جس دن مولانا شبلی کی المامون پر یہ فقرے لکھے:

> ”یہ کتاب اردو زبان میں لکھی گئی ہے اور ایسی صاف و شستہ اور برجستہ عبارت ہے کہ دتی والوں کو بھی اس پر رشک آتا ہوگا۔“
>
> (دیباچہ طبع دوم المامون)

تو درحقیقت انھوں نے اس وقت اس زبان کو لکھنؤ اور دہلی کی گرفت سے آزادی کا خط فرمان لکھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر شہر و دیار کے اہل قلم کو زبان کھولنے کی جرأت اور اپنی بساط کے مطابق عرض متاع کی ہمت ہوئی، اور کچھ ہی دنوں میں اس زبان کا خزانہ ہر قسم کے قیمتی سامانوں اور ذخیروں سے مالا مال ہونے لگا۔

موانع کے باوجود اردو کی ترقی

اس انقلاب نے ملک میں علوم و فنون اور سنجیدہ علوم کی تصانیف کا روز افزوں ذخیرہ فراہم کر دیا اور وہ زبان جو پہلے صرف چند دیوانوں اور کہانیوں کی مالک تھی، وہ ہر قسم کے علم و ہنر سے معمور ہوتی جاتی ہے۔ اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے

اس میں حکومت وسلطنت کی ذرا بھی مدد شریک نہیں ہے۔

ہندوستان کو اگر ایشیا کے دوسرے ملکوں کے ساتھ تعلقات برقرار رکھنے ہیں، تو اس کو اپنی جس زبان کے ذریعہ ان تعلقات کا رشتہ مضبوط کرنا ہوگا، وہ اردو ہے، اس کی ایک سمت میں کابل و بلوچستان سے لے کر بغداد تک فارسی حکمراں ہے، اور دوسری طرف سواحل عرب وافریقہ جبرالٹر تک عربی پھیلی ہے، ان تمام بیرونی قوموں کے لیے ہندوستان کی جس زبان کا سیکھنا نہایت آسان ہے وہ اردو ہے یہی سبب ہے کہ یہ زبان ان تمام ملکوں اور جزیروں میں آسانی کے ساتھ پھیل گئی ہے، جہاں ہندوستانیوں کی آمدورفت ہے، برما، آسام، سیلون (اب شری لنکا)، مالدیپ، انڈمان، مارشیس، سنگاپور، پورٹ بلیر اور افریقہ کے ان مختلف ملکوں میں جہاں جاکر ہندوستانی بسے ہیں اس زبان کو اپنے سینے سے لگاکر ساتھ لے گئے ہیں، ادھر سواحل عرب میں عدن، جدہ بلکہ مکہ معظمہ تک اس زبان میں بات چیت ہوتی ہے، انتہا یہ ہے کہ پورٹ سعید کے ملاحوں اور مصر کے بازاروں تک میں اس کے بولنے والے ملے ہیں، کیا اس پر آپ کو حیرت نہ ہوگی کہ قسطنطنیہ میں اردو سیرۃ النبی اور سیرت عائشہ وغیرہ کے ترجمے براہ راست ترکی میں ہوئے ہیں، مکہ معظمہ میں میری ملاقات ماسکو کے ایک عالم موسیٰ جاراللہ سے ہوئی، جو اردو تصنیف "ارض القرآن" کو ہندوستانیوں سے پڑھتے تھے، ادھر عربی درسگاہوں اور مسافروں اور تاجروں کے ذریعہ یہ زبان یاغستان افغانستان، بخارا بلکہ چینی کاشغر تک اپنا سلسلہ ملاچکی ہے۔

ہندوستان کے پورے طول وعرض میں جہاں بھی مسلمان آباد ہیں، خواہ ان کی مادری زبان کچھ ہو اردو بولی اور سمجھی جاتی ہے اور ان صوبوں میں اردو کی تعلیم کے مکتب اور اسکول قائم ہیں، اس لیے جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، یہ زبان اب تک ملک کی واحد مشترکہ زبان ہے۔

ہندوستان کی اس زبان نے یہاں تک وسعت پائی ہے، کہ یورپ کی یونیورسٹیوں اور لائبریریوں میں اس نے اپنی جگہ حاصل کرلی ہے، کیا ہمارے لیے یہ فخر کی بات نہیں ہے ہماری زبان سے انگریزی فرانسیسی ترک اور فارسی میں اردو تصانیف کے ترجمے ہوئے ہیں، چند مہینے ہوئے کہ پولسٹڈم واقع جرمنی سے میرے پاس ٹوٹی پھوٹی

اردو میں ایک جرمن ڈاکٹر کا خط موصول ہوا۔

ہندی کی اشاعت اردو کے لیے مفید بھی ہے

ہندوستان کے ان صوبوں میں جہاں ہندوؤں میں اردو بہت کم رائج ہے، جیسے مدراس اور بنگال، اگر وہاں ہندی کا رواج دوسری زبان کی حیثیت سے ہو جائے تو میرے خیال میں یہ بھی ہندوستان کے لیے نہایت مفید ہے۔ اوّل یہ کہ کم از کم ایک زبان تو ہندوستان کے منہ میں ہوگی، دوسرے یہ کہ ہندی اردو کا ایک درمیانی زینہ ہے مجھے ایک دفعہ مدراس جانے کا اتفاق ہوا۔ ریل میں ایک مدراسی ہندو بزرگ کے سوا کوئی رفیق نہ تھا، وہ ناگری پرچارنی سبھا کی مدراسی شاخ کے ذریعہ ہندی سیکھ رہے تھے اتنے سہارے پر یہ ممکن ہو سکا کہ ہم انگریزی کی مدد لیے بغیر ایک دوسرے کی بات کچھ سمجھ سکیں۔

انسان جانوروں کو تو لگام لگا کر اپنا تابع دار بناتے ہیں لیکن جب ایک انسانی قوم دوسری انسانی قوم کو اپنا تابع دار بناتی ہے، تو گو اس کے منہ میں لوہے کی لگام نہیں لگاتی تاہم اس کے منہ میں ایک لگام لگا دیتی ہے جس کا نام "بدیسی زبان" ہے۔ انسان کے تمام اعمال اس کے خیالات کے ماتحت ہیں، خیالات کی روح الفاظ کے جسم میں جلوہ گر ہوتی ہے الفاظ زبان کا دوسرا نام ہے، اس لیے کسی دوسری قوم کی زبان کے معنی اس قوم کا تمدن تاریخ، مذہب، جذبات ہر چیز ہیں۔

آپ جب انگریزی پڑھتے ہیں، یا انگریزی بولتے ہیں تو نادانستہ طور سے آپ کے جسم و جان اور ارادہ و روح انگریزی صورت اختیار کر لیتی ہے، زبان کے الفاظ محاورات ضرب الامثال، استعارات ہر چیز اس زبان کی قومیت کی جیتی جاگتی تاریخ ہوتی ہے، اور یہ تاریخ اس قوم کی زندگی کی تجلیوں کا خزانہ ہوتی ہے، جب آپ انگریزی بول رہے ہوتے ہیں غور کیجیے گا کہ اس وقت آپ اپنے اندر انگریزی تاریخ، انگریزی جذبات، انگریزی احساسات، انگریزی خیالات کا سر تا پا مجسمہ بن جاتے ہیں، اور خود اپنی تاریخ، اپنے قومی جذبات، اپنے مذہبی احساسات، اپنے ادبی خیالات سے یکسر عاری ہو جاتے ہیں، ساتھ ہی ساتھ اس زبان کے آداب و معاشرت، طرز تمدن، لباس و پوشاک، لب و لہجہ پر

چیز میں اس بدیسی قوم کی نقالی کرنی پڑتی ہے۔ اب ایسی قوم جو قلباً وقالباً روح و جسم، ظاہر اور باطن دونوں میں دوسری قوم کی نقالی کر رہی ہے۔ خود اپنی قومیت کا وجود اس کے اندر کہاں رہا۔ اب وہ ایسے افراد بن گئے ہیں جو اپنی قومیت کے عناصر کو تو فنا کر چکے ہیں مگر دوسری قوم جس کی وہ نقالی کر رہے ہیں وہ اپنے اندر شمار کرنے سے رہی۔ اس لیے ان کی حیثیت "معزز اچھوت" سے بڑھ کر نہیں۔

لکھنؤ کی ادبی خدمات

لکھنؤ کے خدمات

آج ہم جس تاریخی شہر میں جمع ہیں وہ گو ہمارے پورے ملک کی راج دھانی کبھی نہیں بنا۔ لیکن یہ کہنا بالکل سچ ہے کہ ہمارے علوم و فنون اور شعر و ادب کا مدتوں پایۂ تخت رہا ہے اور اب بھی ہے، شاہ پیر محمد صاحب جن کا ٹیلہ اور ٹیلے پر والی مسجد مشہور ہے، یہاں کے سب سے پہلے عالم ہیں، عالمگیر کے عہد میں سہالی سے فرنگی محل کو علم و فنون وہ خاندان منتقل ہوا جو صدیوں تک ہمارے علوم و فنون کا محافظ اور شیرازِ ہند پورب کا دار العلوم رہا اور اس نئے زمانے میں مسلمانوں کی نئی عربی درسگاہ دار العلوم ندوۃ العلماء کی یہیں بنیاد پڑی، یہاں کا خاندان اجتہاد پورے ملک کے طول و عرض پر تنہا حکمراں ہے۔

دلی کے باغ میں جب خزاں آئی تو یہاں بہار کا دور آیا۔ اس اجڑے باغ کے کتنے مرغ خوش لحن تھے، جنھوں نے اڑ اڑ کر اس چمن کی شاخوں پر بسیرا لیا۔ ہندوستان کی موجودہ بولی پیدا تو سندھ اور پنجاب میں ہوئی، نشو و نما دکن میں پایا، تعلیم و تربیت دلی میں حاصل کی، لیکن تہذیب اور سلیقہ لکھنؤ میں سیکھا۔

اودھ کی راج دھانی جب فیض آباد سے لکھنؤ منتقل ہوئی تو اس کو اور چار چاند لگ گئے، میر تقی میرؔ، انشاء اللہ خاں انشاؔ، جرأتؔ اور مصحفیؔ وغیرہ نے اودھ کا رخ کیا

لہ اس کے اقتباسات اس خطبۂ صدارت سے لیے گئے ہیں جو ۱۶ جنوری سنہ ۱۹۳۶ء کو بمقام لکھنؤ ہندوستانی اکاڈمی کی پانچویں اردو کانفرنس میں پڑھا گیا۔

میرانیس کا خاندان دلی سے پہلے ہی آچکا تھا۔ ان بزرگوں کے دم قدم سے بادشاہوں کے دربار، امرا کی ڈیوڑھیاں اور اہل علم کی محفلیں شعر و سخن کے نغموں سے پرشور بن گئیں۔ ناسخ، آتش، وزیر و صبا اور ان کے شاگردوں کے شاگردوں نے شعر و ادب کے جواہر ریزوں کے ڈھیر لگا دیے۔

شعر و سخن کے چرچوں اور شاعروں کے تفریحی جھگڑوں کو چھوڑ کر نفس زبان کی ترقی محاورات کی نزاکت، الفاظ کی تراش خراش اور اصول و قواعد کے وضع و تالیف کا جو اہم کام گذشتہ دو صدیوں میں یہاں انجام پایا، اسی کا اثر ہے کہ اس نے بولی سے بڑھ کر زبان کا درجہ پایا۔ ملک سخن کے دو اخیر فرماں روا انیس و دبیر نے شاعری نہیں کی، بلکہ اپنے نام سے زبان و ادب کے سکے ڈھال ڈھال کر اہل ملک میں تقسیم کرتے رہے۔

ناسخ نے زبان کی نزاکت و لطافت میں وہ کام کیا جو ہر ایک ہوشیار جوہری جواہرات کے نوک پلک نکال کر جلا دینے میں کرتا ہے۔ ان کے شاگرد والا جاہ میر اوسط علی رشک نے صحیح و غلط، ثقیل و سبک لفظوں کو اس طرح پرکھ کر الگ کر دیا کہ ان کی پسند فصاحت کا معیار بن گئی، سیکڑوں الفاظ جو بول چال میں رائج تھے، مگر شعر و انشا کی بارگاہ میں ان کو بار حاصل نہ تھا، ان کو خود اپنے شعروں میں نظم کر کے پچھلوں کے لیے سند پیدا کی۔ لکھنؤ میں غالباً یہی پہلے شخص ہیں جنھوں نے سنہ ۱۲۵۶ھ سنہ ۱۸۴۰ء میں اردو لغت ترتیب دیا، جس کا نام نفس اللغۃ ہے۔ سید انشاء اللہ خاں کے دریائے لطافت کا دھارا بھی یہیں بہا۔ شیخ امداد علی بحر التوفی سنہ ۱۳۰۰ھ سنہ ۱۸۸۲ء کی نسبت بھی مشہور ہے کہ انھوں نے کوئی لغت لکھا تھا، مگر اس کا سراغ نہیں ملتا۔

حکیم ضامن علی جلال جن کے دیدار کا شرف مجھے بھی حاصل ہے ان شعرا میں ہیں جنھوں نے زبان کو نہ صرف شاعری بلکہ وضع اصول اور تحقیقات کے لحاظ سے بھی مالا مال کیا ہے۔ سرمایۂ زبان اردو، مفید الشعرا، تنقیح اللغات، گلشن فیض اور قواعد المنتخب وغیرہ ان کی وہ کتابیں ہیں جو اردو زبان کا سرمایہ ہیں۔ منشی امیر احمد مینائی کے شاعرانہ خدمات سے قطع نظر، امیر اللغات کے مصنف کی حیثیت سے ہماری زبان پر ان کا بہت بڑا احسان ہے کہ اردو کے اس عظیم الشان لغت کے دو حصے الف ممدودہ اور الف مقصورہ تک چھپ سکے۔ ان کے جلیل القدر شاگرد نواب فصاحت جنگ جلیل سے مجھے معلوم ہوا ہے کہ

کہ رام پور میں اس لغت کا پورا مسودہ موجود ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو ہماری زبان کی بڑی بدقسمتی ہوگی کہ ترقی کے اس روز بازار میں بھی مشتاقوں کی آنکھیں اس عروس فن کی دید سے محروم ہیں۔

لکھنؤ نے شعر وسخن کے ذریعہ سے اس زبان کی جو خدمتیں انجام دی ہیں، وہ ہماری علمی محفلوں کی بار بار کی دہرائی ہوئی کہانیاں ہیں اور جو شہرت کی بنا پر زبان زد خاص وعام ہیں۔

مجھے اس شاہراہ سے ہٹ کر لکھنؤ کی وہ خدمتیں گنانا ہیں جن کو اس دور کے قدرداں بھول گئے ہیں، یا ہماری زبان کی تاریخ سے یہ اوراق گر کر کھو گئے ہیں۔

عہد جدید کی تابانی لکھنؤ کے افق میں

ہمارے ملک میں سات سمندر پار سے آکر جب اہل یورپ نے اپنے نئے علوم و فنون کی نمائش کی ہے تو یہ لکھنؤ کا وہ وقت تھا جب وہ عیش ومسرت کی شراب سے بدمست تھے، اس وقت کس کو ہوش تھا کہ وہ دساور کی نئی چیزوں کی قدر کرے اور بزرگوں کی چھوڑی ہوئی کمائی اور اپنے گھر کی اندوختہ دولت میں جس پر ان کو بڑا غرور تھا باہر سے خرید کر کچھ اور قیمتی سامانوں کا اضافہ کرے، تاہم اس میخانہ میں کچھ اہل ہوش بھی تھے انھوں نے نئے اور پرانے کا جائزہ لیا اور جو چیز ان کے یہاں نہ تھی وہ فرنگستان کی دوکان سے خرید کر لائے۔

یہ سب کو معلوم ہے کہ خاص حالات نے سرکار اودھ اور سرکار کمپنی کو متحد کر دیا تھا اس کا اثر یہ تھا کہ انگریزی ریذیڈنٹ اور ان کا عملہ لکھنؤ میں اور سرکار اودھ کا وکیل کلکتہ میں اور کبھی کبھی لندن میں رہتا تھا، اس میل جول سے دو عظیم الشان مشرقی اور مغربی تمدنوں کا سب سے پہلے یہیں پیوند لگا، اس زمانے کے ریذیڈنٹ اور انگریز حکام اردو فارسی میں پوری مہارت رکھتے تھے، نواب سعادت علی خاں کے دربار میں صاحب ریذیڈنٹ اور انشاء اللہ خاں کی ادبی نوک جھونک کی حکایتیں آب حیات کے ذریعہ مشہور عام ہیں۔

سرکار اودھ کی طرف سے وکالت اور انشاء کے منصب پر جو لوگ سرفراز ہوتے تھے، وہ عموماً اہل علم کے طبقہ سے ہوتے تھے۔ انگریزوں کے میل جول سے وہ بھی

انگریزی علوم و فنون سے آشنا ہو جاتے تھے اور بعض بعض تو کسی نہ کسی جدید علم میں مہارت پیدا کر لیتے تھے۔ خان علامہ تفضل حسین خاں انھیں لوگوں میں سے تھے، وہ گو رہنے والے سیالکوٹ کے تھے اور ریاضیات اور متوسطات کی تعلیم دلی میں پائی، لیکن انتہائی تعلیم لکھنؤ میں ملا حسن فرنگی محلی سے حاصل کی۔ پہلے نواب سعادت علی خاں کے اتالیق مقرر ہوئے، پھر نواب آصف الدولہ نے انشار کو اپنا وکیل بنا کر کلکتہ بھیجا۔ اس اثنا میں انھوں نے انگریزی اور لاطینی زبانیں سیکھیں اور جدید ریاضیات و ہیئت کو حاصل کیا، نواب سعادت علی خاں کے زمانہ میں درس و تدریس اور تالیف کا مشغلہ جاری کیا اور جدید علم ہیئت اور جبر و مقابلہ میں کئی کتابیں تصنیف کیں۔ سنہ ۱۲۱۵ھ سنہ ۱۸۰۰ء میں وفات پائی۔

نواب محمد علی خاں کے زمانہ میں منشی الملک فخر الدولہ، دبیر الملک ہشیار جنگ رتن سنگھ زخمی نے علوم و فنون کی نئی بساط بچھائی۔ گو ان کے بزرگوں کا وطن بریلی تھا، مگر ان کے فضل و کمال کی بہار لکھنؤ میں آئی، بادشاہ کے میر منشی تھے، قدیم علوم کے ساتھ جدید ہیئت و ریاضیات میں بھی ماہر تھے، انگریزی سیکھی تھی۔ حدائق النجوم ان کی مشہور تصنیف ہے، سنہ ۱۲۵۲ھ سنہ ۱۸۳۶ء میں تالیف پائی۔ نئے علم کلام کے لیے نئی اصطلاحوں کا وضع کرنا ان کا خاص کارنامہ ہے۔ کہتے ہیں:

> باید دانست کہ چوں ایراد الفاظ یونانی و برطانیقی (انگریزی) بعینہ در کتاب فارسی و عربی نکردہ و غیر مانوس است و کتب عرب یکسر بہ مذہب بطلیموس کہ فیما نحن فیہ اگرچہ بعضے مطابق بآنست لیکن بسیارے مخالف ازاں و برخے مجدد کہ فضلانے ازاں در تصانیف قدبار پیدا نیست۔ ناچار بوضع واضع از اصطلاحات جدیدہ یا تصرفے در تعریفات و جز آں چنانکہ عادت ترجمان قدیم ہنگام نقل علوم از یونانی بعربی بودہ است من ہم اقتضائے ایشاں کردہ می گویم (ص ۹)

ان ہی لوگوں میں ایک اور قابل ذکر ہستی رائے منولال فلسفی کی ہے، ان کا وطن سندیلہ تھا، فلسفہ و حکمت کے علوم میں دسترس رکھتے تھے، نواب آصف الدولہ کے دربار میں نوکر تھے، دوسری تصانیف کے ساتھ علم حساب و جغرافیہ و ہیئت اور

حکمت انگریزی میں رسائل یادگار چھوڑے سنہ ۱۲۴۸ھ ۱۸۳۲ء میں وفات پائی۔

سرکار اودھ کی طرف سے جو علماء وقتاً فوقتاً لندن بھیجے گئے، ان میں سے دو نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں، مولوی محمد اسماعیل لندنی اور مولوی محمد حسین لندنی، ان دونوں نے یورپ کے جدید علوم وفنون سے اس ملک کو آشنا کیا۔ مولوی محمد اسماعیل لندنی مرادآباد کے رہنے والے تھے۔ نواب نصیر الدین حیدر کی طرف سے سفیر لندن مقرر ہوئے تھے منطق کی بعض پرانی کتابوں پر ان کے حاشیے ہیں، سنہ ۱۲۵۳ھ ۱۸۳۷ء میں وفات پائی۔

مولوی محمد حسین کا ایک عربی رسالہ ندوہ کے کتب خانہ میں ہے، جس میں یورپ کے نئے علوم وفنون، جارج سیل کے ترجمۂ قرآن اور یورپ کے بعض اختراعات کا تذکرہ ہے۔

نواب نصیر الدین حیدر کے زمانہ میں ان دو کے علاوہ اور صاحب قابل تذکرہ ہیں، مولوی عبد الرب اور مولوی کمال الدین حیدر، لکھنؤ میں جو یورپین علماء رہتے تھے، ان سے برابر کی ان کی ملاقاتیں رہتی تھیں، اس کا نتیجہ وہ رصد خانہ ہے جو سنہ ۱۲۴۷ھ سنہ ۱۸۳۱ء میں شاہ نصیر الدین حیدر کے زمانہ میں جنرل مکلاوڈ کی کوٹھی میں بننا شروع ہوا، اور محمد علی شاہ کے زمانے میں بن کر تیار ہوا۔ اس رصد خانہ میں کرنل ولکاکس وغیرہ علماء کے علاوہ مولوی عبد الرب صاحب، مولوی کمال الدین حیدر صاحب اور مولوی اسماعیل صاحب مرادآبادی شریک تھے، اور اب یہ وہ مقام ہے جس میں امپیریل بنک کی عمارت قائم ہے۔

اب تک ملک میں جدید علوم وفنون کی اشاعت کی تاریخ میں لکھنؤ کا نام نہیں لیا جاتا، حالانکہ شاہان اودھ کے زمانے میں لکھنؤ میں بھی ایک دار الترجمہ قائم تھا، نئے علوم وفنون کی کتابیں یہاں ترجمہ ہو کر طبع سلطانی سے شائع ہوتی تھیں۔ اس محکمہ کی طرف سے انیس ۱۹ رسالے چھپ کر شائع ہوئے تھے، جس میں دس رسالوں کے نام ہمیں معلوم ہیں، ان کی تفصیل میں نے معارف سنہ ۱۹۱۷ میں کی ہے۔ یہ ہیئت، کیمیا، مناظر، اور طبیعات اور اس کے اقسام قوت مقناطیسی، علم الماء، علم الہوا، علم الحرارت وغیرہ سائنس کے مختلف علوم پر ہیں، لارڈ بردم کا اردو ترجمہ مقاصد العلوم کے نام سے محمد علی شاہ کے زمانے میں چھپا اور بھوپال کے دفتر صیغۂ تاریخ میں میری نظر سے گزرا ہے۔

لکھنؤ کی اس علمی وتعلیمی مجلس کا نام اسکول بک سوسائٹی تھا۔ اور اس کی ایک

جنرل کمیٹی تھی، جو کتابوں کے ترجمہ و اشاعت کا کام کرتی تھی اور رصد خانۂ سلطانی کا انگریز مہتمم ان ترجموں کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ ایک انگریز نے اردو فن زراعت پر کتاب لکھی تھی،

ضرورت ہے کہ لکھنؤ کی اس اسکول بک سوسائٹی کے مطبوعات کا پتہ چلایا جائے اور آئندہ دلی سوسائٹی اور فورٹ ولیم کالج کے ساتھ اس کا نام بھی لیا جائے۔ اسی عہد کی ایک کتاب اردو حساب میں لوگارتم ہے، جس کا ایک نسخہ ہمارے پاس ہے۔

لکھنؤ کی اوّلیات

لکھنؤ نے اس کے بعد زبان کی جو خدمتیں انجام دی ہیں، افسوس ہے کہ ان کی کوئی مفصل تاریخ موجود نہیں۔ بادشاہوں کے زمانے میں داستان گوئی کا ایک مفصل فن تھا اور بڑے بڑے زبان داں اور زباں آور بادشاہوں اور امیروں کے شبستانوں میں بیٹھ کر اپنی دلچسپ داستانوں سے بادشاہوں اور امیروں کے دل بہلایا کرتے تھے حکیم ضامن علی جلال کے والد بزرگوار حکیم اصغر علی اس فن کے ماہر تھے۔ اخیر زمانے میں اس فن پر کتابیں بھی لکھی جانے لگیں، اس وقت کہانیوں کے کردار دیو، پریاں اور جادوگر اور طلسم ساز ہوتے تھے، داستان امیر حمزہ۔ نوشیرواں نامہ، طلسم ہوش ربا۔ ایرج نامہ وغیرہ مختلف ناموں سے ہزاروں صفحات میں خیالی ادب اور زور بیان کا ایک طلسم کھڑا کیا گیا، اس کتابی طلسم کا فتاح ہمارے ملک کا کوئی دوسرا شہر پیش نہیں کر سکتا۔ ان کتابوں کے مصنف جن کو خدا جانے کس مصلحت سے مترجم کا درجہ دیا جاتا ہے۔ امیر محمد حسین جاہ منشی احمد حسین قمر، شیخ تصدق حسین اور توتارام شایاں وغیرہ ہیں۔ یہ نظم و نثر کے ہزاروں صفحات حق یہ ہے کہ ہماری پرانی زبان کا بہترین نمونہ ہیں۔ نثر میں سرور کا فسانۂ عجائب اور نظم میں نواب مرزا شوق اور دیا شنکر نسیم وغیرہ کی مثنویاں وہ جواہر پارے ہیں جن سے کبھی ادب اردو کی الماریاں سجائی جاتی تھیں۔

امانت کا اندر سبھا مدتوں تک اہل شوق کا تماشا گاہ رہا ہے اور اب یہ بات پوری تحقیق سے ثابت ہو چکی ہے کہ یہ صرف شاعرانہ فسانہ نہ تھا۔ بلکہ واقعی لکھنؤ میں اندر کا یہ اکھاڑا لگتا تھا اور اس کا تماشا پردوں کے ساتھ کھیل کر دکھایا جاتا تھا اور اس طرح اردو میں ان جدید تماشوں اور ناٹکوں کی تمدنی بدعت بھی یہیں پیدا ہوئی۔

میں نے ہندوستانی ادب کی اس صنف کی یہ تمہیدی تاریخ اس لیے بیان کی ہے، تاکہ معلوم ہو کہ قدیم و جدید سے مل کر ہماری زبان میں ناولوں کی پیدائش کے لیے لکھنؤ ہی کی زمین کیوں موزوں ہوئی، جو شرر و سرشار، مرزا رسوا، سجاد حسین. مرزا مچھو بیگ اور جوالا پرشاد برق کی تخلیق کا باعث ہوئی، شرر نے قومی تاریخ اور اصلاح معاشرت کے بعض موضوعات کو اور سرشار نے لکھنؤ کے آخری تمدن کے رسم و رواج اور طریق کو، اور مرزا رسوا نے لکھنؤ کے ایک خاص طبقہ کے خصوصیات کو اس خوبی سے بیان کیا ہے کہ یہ کہنا مبالغہ نہیں کہ انیسویں صدی کا اخیر عہد ان ہی کے دم قدم سے پر رونق رہا تھا. لکھنؤ کے اس ادبی دور میں سرشار کی سیر کہسار اور فسانۂ آزاد. شرر کی فردوس بریں اور مرزا رسوا کی امراؤ جان ادا، اور سجاد حسین کی حاجی بغلول ادب اردو کی بہترین کتابیں ہیں۔

مطبع

آجکل ادبیات کے سلسلۂ تاریخ کی ایک کڑی مطبع بھی ہیں، لکھنؤ میں مطبع سلطانی کے علاوہ مطبع محمدیہ (۱۲۵۵ھ بعہد محمد علی شاہ) محمد یعقوب مطبع علوی علی بخش خاں (۱۲۶۳ھ) مطبع مصطفائی. محمد مصطفےٰ خاں (۱۲۷۱ھ) کانپور. مطبع محمدی محمد حسین لکھنوی کا (۱۲۶۲ھ) مطبع جعفریہ. حکیم مرزا جعفر خاں (۱۲۶۵ھ) مطبع امینی، محمد عباس. مطبع صدیقی عنایت اللہ وغیرہ بہت سے مطبع تھے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب مطبعے مطبع سلطانی. سلطان المطابع کے قانوناً زیر نگرانی تھے، بوجہ پر اس کے مہتمم کپتان مقبول احمد احسان الملک، مرزا محمد مہدی علی خاں بہادر قبول ثابت جنگ کا نام باقاعدہ لکھا جاتا تھا، یہ نام اس عہد کی مطبوعہ کتابوں پر اکثر لکھا ہوا ملتا ہے۔

مطبع مصطفائی اپنی صحت اور صفائی میں معیار کے بلند درجے پر تھا، علما اور طلبہ اس کی چھپی ہوئی کتابوں کے قدرداں تھے، اور اب بھی اس کی چھپی ہوئی کتابیں اہل شوق میں اشرفیوں کے مول خریدی جاتی ہیں۔

سب سے آخر لکھنؤ کے اس مطبع کا نام لیا جاتا ہے جس کی زندگی اب اتنی برس کے قریب پہنچ گئی ہے. اس سے میری مراد نولکشور کا مشہور پریس ہے۔ یہ غدر کے بعد ۱۸۵۸ء میں قائم ہوا، اور بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ مشرقی علوم و فنون کی جتنی ضخیم اور کثیر کتابیں اس مطبع نے شائع کیں ان کا مقابلہ ہندوستان کیا مشرق کا کوئی مطبع نہیں کر سکتا، ہماری

زبان کی اکثر علمی و ادبی کتابیں اس مطبع سے چھپ کر نکلیں، شعراء کے دواوین، مثنویاں، قصائد، مرثیے، افسانے، داستانیں اور درس کی عام کتابیں سب اسی کی کوششوں کی ممنون ہیں۔ تاہم غلط نویسی اور غفلت جو کثرت کا نتیجہ ہے اس کی شہرت کے چہرے کا بدنما داغ ہے۔

شعرائے قدیم میر، سودا۔ ناسخ، آتش، جرأت۔ مصحفی، انشا۔ رند۔ دبیر، صبا، میر مونس، اسیر اور امیر وغیرہ کے دیوان اور کلاموں کے مجموعے اسی مطبع سے نکل کر دنیا کا اجالا ہوئے اور ملک کے گوشہ گوشہ میں زبان کی اشاعت کا سبب بنے۔

مطبع تیغ بہادر بھی صدی کے وسط میں ادب کی اشاعت کا اچھا ذریعہ تھا۔

اخبارات

زبان کی اشاعت کا تیسرا ذریعہ اخبارات ہیں۔ ہمارا یہ شہر اس سلسلہ میں پیچھے نہیں رہا۔ یہ نہیں معلوم کہ یہاں کا پہلا اردو اخبار کون ہے۔ تاہم یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ اس صوبہ میں اردو کا پہلا روزانہ اخبار "اودھ اخبار" یہیں سے نکلا اور جو آج تک نکل رہا ہے۔ اس کے آغاز کی تاریخ سنہ ۱۸۵۸ء ہے اور یہ بے مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ اس اخبار نے اس ملک کے مشہور ادیبوں کے پیدا کرنے اور ان کے پروان چڑھانے میں بہت بڑا حصہ لیا ہے، سرشار اور شرر دونوں اسی اخبار کے ذریعہ شہرت کے اسٹیج پر آئے۔

اردو کا سب سے پہلا کامیاب مذاقیہ اخبار اودھ پنچ بھی اسی شہر کے افق پر نمودار ہوا۔ سید سجاد حسین جن کی ملاقات کی عزت مجھے حاصل ہے اس کے ایڈیٹر تھے یہ وہ اخبار ہے جس کے صفحات میں منشی احمد علی کسمنڈوی، منشی احمد علی شوق، میر اکبر حسین اور سید محمد آزاد وغیرہ ہماری زبان کے وہ پرانے ادیب جو نئے طور طریق سے آگاہ تھے... روشناس ہوئے۔

سنجیدہ اخباروں میں مشیر قیصر (مرتبہ مولوی غلام محمد خاں تپش سنہ ۱۸۹۳ء) اور آئینہ اور آزاد ہفتہ وار اخبار بھی گذشتہ صدی کے ادیبوں کی پیداوار میں معین ہوئے۔ آزاد آخر میں اودھ پنچ کا ضمیمہ ہو گیا تھا۔ یہ میری طالب علمی کا زمانہ تھا۔ سجاد حسین مرحوم بے کار ہو چکے تھے۔ اس وقت آزاد کی چند ماہ "شکمی" اڈیٹری کا فرض چند دوستوں کے ساتھ مل کر میں نے بھی ادا کیا تھا۔

اردو کے سب سے پہلے آزاد سیاسی اخبار "ہندوستان" نے بھی اسی شہر میں جنم لیا۔ گنگا پرشاد ورما اس کے اڈیٹر تھے۔ یہ اپنے زمانے میں کانگریس کے خیالات کا بہترین وکیل تھا، مولانا شبلی مرحوم جو خود بھی کانگرسی خیال کے تھے اس کو بہت شوق سے پڑھا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ اخبار یہ ہے۔

آج تو مسلمانوں میں بہت سے آزاد سیاسی اخبار ہیں، لیکن زمیندار کے بعد سنہ ۱۹۱۰ء میں اس صوبہ کا سب سے پہلا آزاد مسلمان سیاسی اخبار مسلم گزٹ بھی یہیں سے نکلا، جس کے اڈیٹر مرحوم وحید الدین سلیم اور اس کے مشیر خاص اور مضمون نگار مولانا شبلی تھے۔

رسالے

رسائل کے لحاظ سے بھی یہ شہر پیچھے نہیں رہا، میرے موجودہ معلومات کے لحاظ سے یہاں کا سب سے پہلا رسالہ، رسالہ محشر ہے جو مولوی عبد الحلیم شرر کا پہلا ادبی کارنامہ تھا، یہ سنہ ۱۸۸۲ء میں نکل کر دو سال کے بعد بند ہو گیا تھا۔ سنہ ۱۸۸۶ء میں شرر نے اپنا مشہور ادبی رسالہ دلگداز نکالا جو اپنے زمانہ میں جدید طریق تحریر کا بہترین معیار تھا، یہی وہ رسالہ ہے جس نے ملک میں اردو کے بے شمار ادیب اور نثار پیدا کیے، نثر نویسی کا سلیقہ سب سے پہلے شرر ہی کی تحریروں سے ہمارے نوجوانوں میں پیدا ہوا۔

لکھنؤ کا ایک اور ادبی رسالہ ذکر کے قابل ہے، منشی نثار حسین کا پیام یار، یہ گلدستہ ایک زمانہ میں شوق کے ہاتھوں سے لیا اور عزت کی آنکھوں سے پڑھا جاتا تھا اس میں اس عہد کے بڑے بڑے شعراء امیر، داغ، جلیل اور تسلیم وغیرہ اور ان کے باکمال شاگردوں کی غزلیں چھپتی تھیں۔ یہ انیسویں صدی کے اواسط میں حسن و عشق کا تنہا پیامبر تھا۔ جس کی باتوں کو سن کر خدا جانے کتنوں کو عروس سخن کا شیدائی بننا پڑا اور صحیح زبان کے سیکھنے اور لکھنے کا شوق پیدا ہوا۔

اس عہد کا ایک اور ادبی رسالہ مرقع عالم ہے جو حکیم محمد علی خاں کی اڈیٹری میں ہردوئی سے نکلتا تھا، اس کو دلگداز کا حریف سمجھنا چاہیے، حکیم صاحب ناول نویسی میں بھی اپنے وقت میں شہرت رکھتے تھے اور ان کا قلم وقت کا سماں اور سینری دکھانے میں خاص ملکہ رکھتا تھا۔

اوپر کے صفحوں میں جو کچھ کہا گیا ہے، وہ اس شہر کی انفرادی کوششوں کا ذکر تھا جنھوں نے اس زبان کو ملک میں مقبول اور ہر دلعزیز بنا دیا لیکن اب جیسا کہ ہم سب کو معلوم ہے، انفرادی کوششوں کے بجائے اجتماعی کوششوں کی ضرورت ہے اب ہر چیز اسی پانی سے نشو و نما پا رہی ہے اور بڑھ رہی ہے اس لیے زبان کی ترقی میں بھی اب شخصی کوششوں کے بجائے قوم کی یکجائی کوششوں کی ضرورت ہے۔ میں چاہتا تھا کہ ذرہ تفصیل سے کام کا نقشہ پیش کر دوں، مگر وقت کی کمی کا خیال کر کے اختصار کے ساتھ اپنا مدعا عرض کرتا ہوں۔

(۱) ہم کو اپنا لٹریچر اس لیے ناچیز معلوم ہوتا ہے کہ ابھی تک ہمارے سامنے ہماری پچھلی کوششوں کے ثمرے ایک جگہ نہیں ہیں اس لیے ایک وسیع کتب خانہ کا قیام نہایت ضروری ہے۔ اس غرض کے لیے میں یہ تحریر کرتا ہوں، کہ ہندوستانی اکیڈمی، اگر پورے ہندوستان میں نہیں تو یوپی گورنمنٹ کا ایک جز ہونے کی حیثیت سے آئندہ اسمبلی میں یہ تجویز پیش کرائے کہ برٹش میوزیم لائبریری کے اصول کے مطابق صوبہ یوپی کا ہر مطبع ہر کتاب کا ایک ایک نسخہ اس کے کتب خانے کے لئے کلکٹر ضلع کے دفتر میں پیش کرے

(۲) ہم کو ہندوستانی زبان کی ترقی کے لئے اس پرانے خیال کو دل سے نکال دینا چاہیے کہ یہ زبان فارسی یا سنسکرت سے نکلی ہوئی ہے یا وہ کسی بھاشا کا ضمیمہ ہے بلکہ وہ خود ایک مستقل زبان ہے جس کے الفاظ خود اسی کے ہیں اور جس کے قواعد خود اس کے ہیں، یہ نکتہ ذہن میں نہ رہنے کے سبب ہم میں سے بعض صاحبوں کو یہ دھوکا ہے کہ وہ ہندوستانی لفظوں کی صحت اور غلطی کی پہچان عربی، فارسی یا ہندی یا سنسکرت سے کرتے ہیں، اس اکیڈمی کے ایک لائق صدر نے ہندوستانی میں موت اور روح وغیرہ لفظوں کو مؤنث ماننے میں اس لیے شک ہے کہ اصل سنسکرت میں وہ مؤنث نہیں، اسی طرح میں نے ایک دفعہ عربی نثر کی ہندوستانی جمع اثرات استعمال کی، تو الہ آباد کے میرے ایک لائق اور پرانے اہل قلم دوست نے اس لیے مجھ کو ٹوکا کہ عربی میں اس کی جمع اثرات نہیں بلکہ آثار ہے، حالانکہ ہماری زبان میں لفظ اثر کی یہ دونوں جمعیں دو معنوں میں آتی ہیں۔ عربی میں آثار کے کچھ ہی معنی ہوں مگر ہندوستانی میں اس کے معنی قرینے کے ہیں، آثار یہ ہیں، آثار یہ معلوم ہوتے ہیں اور اثرات کا لفظ نتیجے کے معنی رکھتا ہے، اس لیے

ہمیں ہندوستانی زبان کو مستقل زبان مان کر اس کی خودمختاری کا اعلان کر دینا چاہیے

اسی طرح لفظ اصل کو دیکھیے جس کے معنی عربی میں جڑ کے ہیں، اس کی جمع عربی میں اصول ہے مگر اردو میں اصول ایک مفرد کی لفظ کی طرح قاعدے کے معنی میں بولا جاتا ہے اور اس کی جمع اصولوں بنائی جاتی ہے. خود قاعدہ کے عربی معنی بنیاد کے ہیں. اس کی جمع قواعد ہماری زبان میں دو معنوں میں آتی ہے، جب اس کو جمع بولیں تو اصول کے معنی میں مذکر، اور جب مفرد بولیں تو نحوی قواعد کے معنی میں وہ مفرد ہے اور مؤنث۔

مواد کا لفظ مادہ کی جمع ہے، مادہ کے لغوی معنی ہیں پھیلنے والی چیز اور اصطلاحی معنی میٹر، لیکن اب مواد کا لفظ ہماری زبان میں مفرد ہے اور زخم کی آلائش کے معنوں میں ہے اور میٹر کے معنوں میں اور کسی مضمون کے ضروری معلومات اور مسالے کے لیے بھی وہ بولا جاتا ہے۔

خود مسالے کی اصلیت عربی میں مصالح ہے اور وہ مصلح کی جمع ہے یعنی وہ چیزیں جو کسی کھانے کی اصلاح کے لیے اس میں ملائی جائیں۔ مگر اب وہ ہماری زبان میں مسالا لکھا جاتا ہے. (م س ال ا) اور لکھا جانا چاہیے. اور اب وہ کھانے کے مسالے کے ساتھ ہر مضمون کا مسالا بن گیا ہے۔ عربی کا مشعل ہماری زبان میں مشال بن گیا ہے۔

ایسی ہی مثالیں ہندی سے بھی دی جا سکتی ہیں۔

آخری مثالوں میں یہ بات بھی ہمارے بزرگ کچھ کچھ قبول کر چکے ہیں کہ عربی میں کسی لفظ کی اصلیت کچھ ہو اور اس کا املا بھی کچھ ہو مگر ہماری زبان کے استعمال میں اگر اس کا تلفظ اور املا بدل گیا ہے تو وہی غلط تلفظ ہماری زبان میں صحیح ہوگا جیسے ہم مصالحہ کو مسالا اور مشعل کو مشال لکھتے ہیں اور بولنے لگے ہیں، بلکہ ضحیح کو بھی ہم نے صحیح کر لیا ہے۔ ذرہ ذرا اور طیار تیار اور خراط خراد ہو گیا ہے تو کیا اس قسم کی کمی بیشی ہم دوسرے لفظوں میں نہیں کر سکتے۔ فارسی والوں نے عربی کے مصدروں کے آخر میں سے ت کو نکال دیا ہے. مثلاً مدارات سے مدارا، محابات سے محابا، یا تماشی کو تماشا، تجلی کو تجلا یا اسم فاعل کے آخر سے ی کو گرا دیا. مثلاً محاذی کو محاذ کر دیا اور اب ہم بھی محاذ بولتے ہیں، اسی طرح کوئی وجہ نہیں کہ ہم ہندوستانی ان میں تصرفات نہ کریں. جیسے جن مصدروں یا لفظوں کے آخر میں ع ہو، ہم ہندوستانی لہجے میں ان کو نہیں بولتے اگر ان کو لکھنے میں گرا دیا جائے.

توبرا کیا ہے، جیسے اطلاع کو اطلا، اجتماع کو اجما۔ اتباع کو اتبا۔ نزاع کو نزا۔ انتزاع کو انتزا، مطلع کو مطلے اور تبع کو تبے وغیرہ[1]

(۴) دلی اور لکھنؤ کے استادوں نے ہمارے لیے ایک اور مثال متروکات کی چھوڑی ہے یعنی بہت سے لفظوں کو ثقیل یا نامانوس سمجھ کر چھوڑ دیا۔ یا ٹکسال باہر کر دیا ہے، جیسے تلک، تئیں، دکھلانا اور بتلانا وغیرہ۔ کوئی وجہ نہیں کہ آج بھی ہم اس اصول سے کام نہ لیں۔ نمط کا لفظ مانند اور طرح کے معنوں میں پہلے بولتے تھے، مگر اب نہیں بولتے اس لیے عربی، فارسی اور سنسکرت کے ان موٹے موٹے لفظوں کو جن کے کام میں لانے کی ضرورت سرے سے نہیں اور وہ اسی لیے بولے یا لکھے گئے کہ ان سے ان کے لکھنے اور بولنے والے کی لیاقت ظاہر ہو ان کو اپنی ڈکشنری سے الگ کر دیں اور ان کو ٹکسال باہر سمجھیں

(۵) ان موٹے نامانوس لفظوں کے استعمال کی ایک وجہ یہ بھی ہوئی ہے کہ بڑے بڑے اہل علم اور خصوصاً یورپ کے فاضل بہت سے معنوں اور چیزوں کے ٹھیٹ ہندوستانی لفظوں سے واقف نہ تھے یا نہیں ہیں وہ ان کی جگہ پر عربی و فارسی کے لفظ جیسے تقاطر، امطار، اوائل ریعان بدو شعور بول کر اپنی ناواقفیت پر پردہ ڈالتے ہیں اور اب بھی ڈالتے ہیں، اسی لیے یہ ضرورت معلوم ہوتی ہے کہ ایسا لغت لکھا جائے جس میں عربی و فارسی کے مشکل لفظوں کے مرادف ٹھیٹ ہندوستانی لفظ ہوں۔ اس کام کو لکھنؤ اور دہلی کے اہل زبان بہتر کر سکتے ہیں۔ اور پھر وہ لفظ پورے ملک میں پھیل سکتے ہیں۔

(۶) اس قسم کا لغت نئی اصطلاحوں کے بنانے میں بھی کام آسکتا ہے۔ آپ دیکھیں کہ چھاپے کا کام بالکل نیا ہے اس کے سارے پرزے اور کام کی چیزیں سب نئی ہیں، مگر چونکہ یہ فن پڑھے لکھے ارباب لغت کے ہاتھوں میں نہیں بلکہ ان پڑھ جاہلوں کے ہاتھوں میں رہا ہے اس لیے انھوں نے اس کے لیے کسی اکیڈمی کی طرف رجوع کیے بغیر سارے لفظ اور اصطلاحیں بنا لیں، جو سب کے سب ہندوستانی ہیں یا ہندوستانی کر لی گئی ہیں۔

---

[1] میں نے لکھنے کو تو یہ لکھا مگر اردو والوں نے اس خیال سے اس تجویز کو پسند نہیں کیا کہ اس سے لفظوں کی اصلی حقیقت مٹ جائے گی مگر ہندوستانی تحریک والوں نے اس تجویز کا خیر مقدم کیا ہے۔ اب زمانہ آگے بتائے گا کہ یہ تجویز کہاں تک حسن قبول کو حاصل کرتی ہے۔

جس کاغذ پر لکھا گیا وہ کاپی، اس کی غلطیاں دیکھی گئیں، تو تصحیح ان غلطیوں کو کاتب نے درست کر لیا، تو ترمیم، اس کی نقل پتھر پر سے اتاری گئی تو پروف۔ دوسری طرف اتار گیا تو مطابق، تیسری دفعہ دکھایا تو سطابق، چوتھی دفعہ دکھایا گیا تو چطابق۔ پتھر سے حروف اڑ گئے تو چھن گئے، کاپی کو گرم پتھر پر رکھ دیا تو کاپی کو جمایا۔ کاپی کے حروف بگڑ گئے تو کچل گئے، غرض اسی طرح اِن اَن پڑھوں نے اپنی ساری ضرورتیں پوری کر لیں اور اصلاح بنانے والوں کی راہ نہیں دیکھتے رہے۔

(۷) ہمارے ہندی کے دوستوں کو شکایت ہے کہ ہم ہندی کے لفظ قصداً چھوڑتے ہیں، حالانکہ یہ بات نہیں ہے، زبان کا سارا دار مدار لفظوں کے چلن پر ہے، ہندو مسلمان آپس میں جتنا ملیں گے اتنے ہی فارسی اور ہندی کے لفظ گھلیں اور ملیں گے، چنانچہ جب ہمارے بزرگ آپس میں خوب گھلے ملے تھے، دیکھیے کہ سیکڑوں ہندی کے لفظ مسلمانوں کی زبان پر اور سیکڑوں عربی فارسی کے لفظ ہندو منشیوں کے قلم پر چڑھ گئے۔ دلی کے زمانے کی زبان دیکھیے اس میں آج سے کتنے زیادہ ہندی لفظ ہماری زبان میں تھے آج تو ہندوستانی میں فارسی عربی لفظوں کی ملاوٹ کے گنہ گار مسلمان ہیں، مگر ہندو مسلمان دونوں سے الگ سات سمندر پار کے ایک بے لاگ کی گواہی سنیے۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے سنہ ۱۹۲۹ء کے اڈیشن میں ہے:

> اردو کا یوں شدید طور پر فارسیت آمیز ہو جانا ایرانی اثر سے زیادہ ہندی اثر سے تھا، اگرچہ اپنی اصل کے اعتبار سے اسلامی تھا تاہم اس میں فارسی عنصر کو کثرت سے داخل کرنے والے ان ایرانی یا ایرانی نژاد لوگوں سے زیادہ ہندو عمال تھے، جو حکومت مغلیہ میں ملازم اور فارسی داں تھے کیوں کہ وہ (ایرانی اور مغل) صدیوں سے اپنا علم و ادب کے لیے صرف اپنی ہی فارسی زبان استعمال کرتے آئے تھے، (ص ۷۰۵ جلد ۱۱)

لیکن یہ بھی اسی لیے ہوا کہ فارسی تعلیم یافتہ ہندو عمال بکثرت مسلمان افسروں سے ملتے جلتے تھے۔ تو ان کے لفظ ان کی زبانوں پر چڑھ جاتے تھے۔ اسی طرح جو مسلمان صوفی درویش اور عام لوگ بلکہ بادشاہ تک جو کثرت سے ہندوؤں سے ملتے تھے ان کی زبانوں پر ہندی الفاظ بڑی آسانی سے چڑھ گیے تھے، آئین اکبری اور فارسی کی دوسری مغل

تاریخوں اور صوفیوں کے دکھنی اور گجراتی ہندوستانی کلام میں اس کی جھلک معلوم ہوتی ہے۔ آج سے صدیوں پہلے خواجہ صدرالدین من جھنگ میں کہتے ہیں:

اک روپ تھے کیوں ہوئے بہروپ   ہر روپ میں دیکھا نو پیے کے روپ
جگ ہے تو یہ جگ دستا ہے سارا   جگ نہیں تو سکل جگت اندھیارا
جس جگ میں گیان کی اچھی جوت   اس جگ کو سمجھے کہ ہے وہ ہے لاہوت

میں مثال کے طور پر کہتا ہوں کہ سنہ ۱۹۱۹ء سے سنہ ۱۹۲۵ء تک ہندو مسلمان مل کر ایک سیاسی تحریک میں شریک تھے، ہر جگہ وہ مل کر ہر مجمع میں جس میں ہندو مسلمان دونوں ہوتے تھے تقریریں کرتے تھے۔ اس موقع پر اپنی تقریر کا اثر بڑھانے اور مجمع کو اچھی طرح سمجھانے کے لیے دونوں قوموں کے باتونی ایڑی چوٹی کا زور لگاتے تھے کہ ان کی ہر بات دونوں سمجھ جائیں۔ اب ہندو مجبور ہوتے تھے کہ ترک موالات بولیں اور مسلمان مجبور ہوتے تھے کہ اسہیوگ کہیں۔ چنانچہ اس زمانہ میں سوراج، نراج، سامراج، اندولن، پرستاؤ، چناؤ، راج نیتک، سبھاپتی، کرپا، شانتی، سماج اور پریم کے لفظ بے تکلف بڑے بڑے جبہ و دستار والے بولنے لگے تھے، ایسے ہی ہندو دوست عربی و فارسی کے سیاسی لفظ بے اختیار استعمال کرنے لگے تھے۔

(۸) اسی لیے میری یہ تجویز ہے کہ ایسے آسان ہندی لفظوں کا ایک لغت فارسی خط میں لکھا جائے، اس کے ہم معنی ہندوستانی لفظ بتلائے جائیں تاکہ وہ آسانی سے ہندوستانی میں شامل ہو سکیں۔

(۹) ہم کو ہندو دوستوں سے یہ بھی کہنا ہے کہ وہ بھی ہندی کے بڑے بڑے لفظ بولنے سے بچیں، مجھ کو ہندو دوستوں کے ساتھ کبھی کبھی ان کے جلسوں میں جانا پڑا ہے اور بعض بعض ایسے آناڑیوں کی تقریریں سنی ہیں کہ جن کا ایک لفظ بھی میری سمجھ میں نہیں آیا ہے اور اس پر مزہ یہ ہے کہ اس تجویز کی تائید بھی میرے ذمہ تھی۔

ہندو یونیورسٹی کے ایک ریسرچ اسکالر اپنے مضمون کی ضرورت سے میرے پاس اکثر آتے رہے، لیکن انگریزی کا سہارا نہ ہوتا تو میں نہ ان کی سمجھ سکتا تھا اور وہ نہ میری، کیا مجھ کو اور ان کو کوئی ایک دیس کا رہنے والا سمجھ سکتا ہے، ہندی جس طرح سنسکرت سے کٹ چھنٹ کر بنی ہے، اسی ہندی سے کٹ چھنٹ کر ہندوستانی بنی ہے، اب ہمارے

ہندو دوستوں کی یہ کوشش کہ پھر ہندی لفظ کو اسی روپ میں بولیں جس میں وہ ٹھیٹ ہندی میں بولا گیا ہے، ایک طرح کا ظلم ہے میں ایک مثال دیتا ہوں۔ لیکن کے معنی پرنتو، ایک ہندی لفظ ہے۔ وہ اردو میں کٹ چھنٹ کر پر ہو گیا۔ اب اسی جگہ پرنتو بول کر بے پر کی اڑانی کہاں تک درست ہے۔ ہر کلام میں اور کی ضرورت کتنی دفعہ ہوتی ہے اور ہندی کا لفظ ہے جس کو اردو نے قبول کر لیا ہے مگر اس لیے کہ یہ اردو میں چل گیا ہے اس کو چھوڑ کر تتھا بولنا کہاں تک صحیح ہے۔ پانی ہندی ہی کا لفظ ہے اور فارسی والے اتنے پرانے زمانے سے اس سے مانوس ہیں کہ سنائی (۵۴۵ھ) اور سعدی تک نے اپنی زبانیں اسی پانی سے سیراب کی ہیں مگر اب لفظی چھوت کے ڈر سے پانی کا لفظ بھی آپ چھوڑ دیں اور جل پینے لگیں تو یہ کتنی بے گانگی ہے۔

(۱۰) ہماری پرانی اردو میں جب وہ دکھنی یا گوجری یا ہندی کہلاتی تھی، ہندی کے سیکڑوں پیارے اور میٹھے لفظ تھے جن کو اردو کے چلن سے بعض نفاست پسندوں نے نکال دیا جیسے موہن، موہ، سجن، بچن، پریم، داس، ریت، بس، روگ، پریت، درپن، جگت، بردہ، ٹک، مکھ، پی، چھب، پیا، لٹک (ادا) سنسار، دیا، چرن، پیتم، ادھک (بہت)، ندھڑک (بے دھڑک) نگر، اپاس، میا (مروت) نپٹ، درس (دیدار) پریت وغیرہ ان لفظوں کو دوبارہ کام میں لانا چاہیے۔

(۱۱) اس سلسلے میں سب سے بڑی چیز یہ ہے کہ لفظوں کے لینے اور نکالنے میں عربی و فارسی و سنسکرت و ہندی کی ڈکشنریوں کو کسوٹی بنانا اور ان میں سے دیکھ دیکھ کر لفظوں کو چننا اور کلام میں لانا ہماری مشترکہ ہندوستانی زبان کے حق میں زہر ہے۔ اس کی سچی کسوٹی رواج و چلن ہے آج جو لفظ عربی، فارسی، ترکی، ہندی، مرہٹی، گجراتی، پرتگالی اور انگریزی کے عام طور سے برتے جا رہے ہیں وہ ٹھیٹ ہندوستانی لفظ ہیں ان کو اسی تلفظ کے ساتھ بولنا چاہیے جس کے ساتھ وہ بولے جاتے ہیں۔ ہمارے نامور شاعر غالب نے نمبر کو لمبر باندھا:

مجھ کو ڈر ہے کہ نہ چھینے ترا لمبر سہرا

اس سے محاورہ بنا لمبر لے جانا، لمبر چھیننا، لمبر لگانا۔

رپورٹ انگریزی لفظ ہے، تھانے والوں کی زبان میں یہ رپٹ ہو گیا اور اس کے خاص معنی ہو گئے۔ یہاں تک کہ لسان العصر اکبر نے کہا:

حریفوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کر یہ تھانے میں
کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

دوسرے انگریزی لفظوں میں بھی اسی قسم کا تصرف کیا گیا ہے اور وہی صحیح ہے۔ عربی فارسی لفظوں کا بھی یہی حال ہے بلکہ خود عربی و فارسی زبانوں کا قاعدہ بھی یہی ہے جس کو تعریب یا تفریس کہتے ہیں۔ اسی اصول پر سنسکرت اور ہندی کے لفظ بھی جس شکل میں ہندوستانی میں آگئے ہیں، ان کو پھر سنسکرت اور ہندی کے اصلی روپ میں بولنے اور لکھنے کی کوشش بنی بنائی زبان کو بگاڑنا ہے۔ اور یہ کرنا ہے کہ دوسری قومیں ان کی بات کو نہ سمجھ سکیں۔ آس کو آشا۔ برہمن کو برہمنڑ اور گن کو گنڑ کہنا ادبی پاپ ہے۔

عربی میں لفظ شہوت خواہش کے معنی میں ہے جو کھانے پینے مطالعہ کتاب ہر ایک کے ساتھ بولا جاتا ہے۔ مگر ہماری ہندوستانی میں ایک خاص معنی میں بولا جاتا ہے اور اس سے اشتہا بنایا گیا ہے۔ جو کھانے کی رغبت کو کہتے ہیں، یہ بھی اس معنی میں عربی نہیں مگر یہ دونوں ہماری ہندوستانی کے لفظ ہیں اور صحیح ہیں۔

عربی میں شکور اس کو کہتے ہیں جس کا شکریہ ادا کیا جائے۔ مگر ہماری زبان میں اس کو کہتے ہیں جو کسی کا شکریہ ادا کرے اسی لیے شکور کی جگہ بعض عربی کی قابلیت جتانے والے اس کو غلط سمجھ کر صحیح لفظ شاکر یا متشکر بولنا چاہتے ہیں، مگر ان کی یہ اصلاح شکریہ کے ساتھ واپس کرنی چاہیے۔

خود لفظ شکریہ کو دیکھیے، اصل عربی ہے، مگر شکل عربی نہیں، اب اس سے ہم نے دو لفظ بنائے ہیں، شکر اور شکریہ خدا کا شکر ادا کرتے ہیں، اور انسانوں کا شکریہ۔ وہ ناشکرا ہے۔ جو زبان کی اس توسیع کی نعمت کی قدر نہیں کرنا چاہتا ہے۔

(۱۲) ہمارے علم و فن کے ماہروں کی ایک خو ہے کہ وہ اپنے لیے کسی لفظ کو اس وقت تک علمی اصلاح بننے کے قابل نہیں سمجھتے، جب تک اس میں بیگانہ پن اور موٹاپن نظر نہ آئے مثلاً دو دریاؤں کا میل جہاں پر ہو اس کے لیے ملتقی البحرین یا دریا میں جہاں پانی پینے کے لیے جگہ ہو اس کو مورد کہیں گے، حالانکہ پہلے کو آسانی سے سنگم اور دوسرے کو پن گھٹ کہہ سکتے ہیں۔ ڈائل کو دھوپ گھڑی کی جگہ ساعت شمسیہ یا دائرہ ہندیہ کہنا ظلم ہے ہمارے عوام نے ریل، جہاز، ہوائی جہاز، گھڑی، گھڑی کی سوئی سیکڑوں لفظ بنا لیے مگر ان کو قاموس دیکھنے کی ضرورت نہیں ہوئی، ہم جانتے ہیں کہ علمی اصطلاحات میں دقتیں ہوتی ہیں، مگر یہ آسانی سے ممکن ہے کہ اصطلاحات میں جہاں تک ہو غرابت سے بچا جائے

یہی حال ہندی کے بعض فاضلوں کا ہے کہ انھوں نے بھی نئی ضرورتوں کے لیے سنسکرت اور ہندی کے شبد ساگر کا غوطہ لگایا موتی اور پتھر جو ان کے ہاتھ آگیا، اس سے ایک مصنوعی زبان بنالی، میرے ایک تعلیم یافتہ ہندو دوست نے بتایا کہ ہندی کے شاعر ڈکشنری دیکھ کر لفظ چنتے ہیں اور ان کو شعر میں باندھتے ہیں اور کہنے کے بعد وہ خود بھی نہیں سمجھتے ہیں کہ ہم نے کیا کہا ہے غرض کہنا یہ ہے کہ ہم ہندوستانی زبان کے لفظوں کے پرکھنے کی کسوٹی دوسری زبان کی ڈکشنریوں کی جگہ رواج اور چلن کو بنائیں، چلتے ہوئے سکوں کو قبول کریں اور کھوٹے کو پھینک دیں۔

آخر میں یہ کہنا ہے کہ اس ہندوستانی کو ہندو مسلمانوں کی ایک زبان بنانے کے لئے ضروری ہے کہ دونوں مل کر اس کو اپنائیں، اور جہاں تک ہو سکے اس کو آسان اور سب کی سمجھ میں آنے والی بنانے کی کوشش کریں، اگر ایسا نہ کیا گیا تو ہندو مسلمانوں میں آپس میں بات کرنا بھی محال ہو جائے گا، انگریزی کے سہارے یگانگت کا خیال پرائے مال کے بل پر دولت مند بننے کی آرزو ہے۔

بعض پرانے لفظوں کی نئی تحقیق

لغت کا کام عام طور سے لفظوں کے معنی بتانا سمجھا جاتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ قوموں کی طرح، قوموں سے متعلق ہر چیز مستقل تاریخ رکھتی ہے، زبان قوم کی تاریخ کا نہایت اہم جزو ہے اس لیے زبان اور اس کے لفظوں کی تاریخ بھی بڑی اہمیت رکھتی ہے اور یہ تاریخ ہمارے لغت کا بڑا اہم باب ہے، لیکن افسوس ہے کہ اس طرف ابھی تک ہماری زبان کے لغت نویسوں نے توجہ نہیں کی ہے۔

قومیں اپنی تاریخوں میں کتنی ہی خیانت کریں اور ان کے واقعات کو الٹ پلٹ ڈالیں، مگر زبان اور اس کے الفاظ کا ذخیرہ ایک سچے امانت دار کی طرح پچھلی روداد کا ریکارڈ یا مسل ہمارے لیے تیار رکھتا ہے جس سے اس زبان کے محقق ضرورت کے وقت پوری طرح فائدہ اٹھا سکتے ہیں، چنانچہ اگر ہم یہ جاننا چاہیں کہ کسی قوم سے تعلقات اور رابطے دنیا کی کن کن قوموں سے رہے ہیں تو اس قوم کے لفظوں کے خزانے میں ہمارے لیے معلومات کا بڑا سرمایہ محفوظ ملے گا۔

ہماری ہندوستانی اردو زبان کی عمر چاہے کتنی ہی چھوٹی ہو پھر بھی اس کی ملکیت میں ایسے لفظوں کی کمی نہیں جو اپنی مستقل تاریخ رکھتے ہیں اور اپنی خاموش زبان سے ہم کو سنانے کے لیے بہت سے ایسے واقعات یاد رکھتے ہیں جن کو کاغذی تاریخ کے اوراق بھلا چکے ہیں۔

ہم اپنی زبان کے اس قیمتی سرمایہ کا آغاز سکوں سے کرنا چاہتے ہیں تاکہ یہ لفظی

یہ مقالہ ہندوستانی اکاڈمی کے ادبی کانفرنس الہ آباد میں پڑھا گیا۔

دولت مضمون کی معنوی دولت کے لیے فالِ نیک بن سکے۔

دام: ہماری زبان کا ایک پامال لفظ دام ہے۔ ایک تو اس کے معنی قیمت کے ہیں اور دوسرے معنی ایک معمولی سکہ کے ہیں جس کی ایک ذلیل ترین صورت ہماری زبان میں چھدام کی ہے، جو چھے اور دام دو لفظوں سے بنا ہے اس لفظ کی تاریخ کے لیے آج سے دو ہزار سال پہلے ہم کو لوٹ کر جانا ہے، ایک زمانہ تھا کہ یونان کے کشور کشا اور سوداگر پورے ایشیا پر چھا گئے تھے، مصر و شام و عراق سے ایران اور ہندوستان تک کے ڈانڈے مل گئے تھے، ان ملکوں میں یونانی حکم اور یونانی سکے چلتے تھے اور ان کے یونانی نام زبانوں پر تھے۔

یونانیوں کے چاندی کے سب سے کم قیمت سکہ کا نام درہم تھا، اس نے عربی میں درہم، اور فارسی میں بیچ سے ایک حرف گرا کے درم کی صورت اختیار کی اور ہندوستان میں ایک حرف گرا کر اور اس کی جگہ ایک لمبی آواز بڑھ کر دام ہوگیا۔ یہ لفظ جس طرح سکہ کو بتاتا ہے، سکہ کے وزن کو بھی بتاتا ہے، چنانچہ عربی طب میں دواؤں کا وزن درہم اور فارسی طب میں درم سے بتایا جاتا ہے۔ اسی لفظ نے جب فرنگستان کی ٹوپی پہنی تو ڈرام ہوگیا جو اب ہمارے انگریزی طبی کالجوں، دواخانوں اور شفاخانوں میں ایک بنگالی کی حیثیت سے وارد ہے۔ اور شاید اب کوئی پہچانے بھی نہیں کہ دام ڈرام دونوں کی شخصیت ایک ہی ہے، صرف آب و ہوا لہجہ اور شکل و صورت کا فرق ہوگیا ہے۔

اکبر کے زمانے میں دام چاندی کے سب سے چھوٹے سکے کے بجائے تانبے کے سکہ کا نام تھا (ص۱۸ نولکشوری)[1] اس کو پہلے پیسہ کہتے تھے اور اب بھی کہتے ہیں، یہ روپیہ کا چالیسواں حصہ تھا، پھر ایک دام کے پچیس حصے کر کے ہر حصہ کو جیتل کہتے تھے اب اس کو گنڈہ کہتے ہیں اکبر کے زمانے میں بھی اس کا نام ملتا ہے۔ (ص ۱۲)

اسی تقسیم سے ایک محاورہ پورب کی زبان میں اور چلا ہے ہر گانوں یا ہر زمیندار کی ملکیت ۱۶ آنے فرض کی جاتی ہے اور یہ آنے پھر پائی اور دام پر بانٹے جاتے ہیں ایک دام کا آدھا ادھیلا اور ۱/۴ پاؤ اور ۱/۸ دمڑی کہلاتا ہے اور یہ اخیر لفظ دام

---

[1] آئین اکبری جلد اوّل

کی تسغیر یا تحقیر ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوگا کہ جو دام قیمت کے معنی میں ہم بولتے ہیں وہ اسی سکہ کی یادگار ہے جس سے پہلے چیزوں کی قیمت کا اندازہ اور لین دین کا کاروبار کرتے تھے۔

آئین اکبری کے مطابق ایک من تانبے میں ایک ہزار چوالیس دام (پیسے) تیار ہوتے تھے۔

تغلقوں کے زمانہ میں "درم سنگ" خرید و فروخت کی تول میں باٹ کے معنی میں بولا جاتا تھا۔ (فیروز شاہی ضیاء برنی ص ۳۱۹)

کیرانت

اودھ کے دیہاتی کاغذوں میں ۱۶ آنے کی تقسیم آنوں پر اور آنوں کی پائیوں پر اور اس کے بعد کیرانت اور جَو پر ہوتی ہے، لفظی ہیر پھیروں کے پہچاننے والوں کو اس کے پہچاننے میں دقت نہیں ہو سکتی، کہ یہ کیرانت عربی قیراط کی خرابی ہے اور عربی زبان میں یہ لفظ قیراط یونانی سے آیا ہے[1] آجکل انگریزی میں یہی لفظ کیرٹ (Carat) کی صورت میں مستعمل ہے اور انگریزی سونے کے بنے ہوئے زیوروں اور چیزوں میں اتنے کیرٹ گولڈ کی اصطلاح کا عام رواج ہے۔

اشرفی

درم اور قیراط جس طرح باہر سے آئے ہوئے نام ہیں اسی طرح ہمارے سب سے قیمتی سکہ اشرفی کا نام بھی باہر سے آیا ہوا ہے، مجھے بہت دنوں سے اس کی اصلیت کی تلاش تھی اور پتہ نہ چل کر اس کو یہ کہہ کر تسکین دے لی کہ چونکہ یہ طلائی سکہ سب سکوں میں اشرف ہے اس لیے اشرفی کہلایا، مگر دفعۃً ایک غیر متوقع ماخذ سے اس کی اصلیت دریافت ہوئی تو معلوم ہوا کہ سکہ اشرف نہ تھا، بلکہ جس بادشاہ کی طرف وہ منسوب ہے وہ اشرف تھا۔

طلائی سکہ کے لیے سب سے پرانا نام دینار ہے اور یہ بھی یونانی ہے[2]، مگر چونکہ عربوں میں یہ سکہ جاری تھا، اس لیے انھوں نے عبدالملک کے زمانے میں سنہ ۷۴ھ سنہ ۶۹۳ء

---

[1] لسان العرب لفظ قرط ج ۹

[2] جرجی زیدان نے اس کو لاطینی لکھا ہے، تاریخ تمدن اسلامی ص ۱۱۹ ج

یا ۵ھ سنہ ۶۹۴ء[1] جب اپنا طلائی سکہ ڈھالا تو اس کا نام دینار ہی رہنے دیا، جب ان کے قدم ہندوستان پہنچے تو ان کا دینار بھی ان کے ساتھ آیا اور آج تک خاندانی مسلمانوں میں دین مہر کی تعداد میں سکۂ رائج الوقت کے ساتھ "چند دینار سرخ" رسمی طور سے جاری ہے۔

تغلق کے زمانے میں ہم کو اشرفی کے لیے دو لفظ ملتے ہیں ایک تنکۂ زر یہ تنکہ سکہ کے معنی میں عام طور سے بولا جاتا تھا[2] (برنی ص ۳۱۴ و ص ۳۱۵) اور اسی سے تنخواہوں کی تعیین ہوتی تھی پیادے کی ماہانہ تنخواہ ۲۳۴ تنکہ اور سوار کی ۸، تنکہ تھی۔ (برنی ص ۳۱۹) مخدوم زادہ بغداد کے لیے دس لاکھ تنکہ تھی (برنی ہوا۔ (برنی ص ۴۹۶) مصری خلیفہ کا سفیر جب سلطان محمد تغلق کے دربار میں آیا ہے اور جمعہ کے دن خلیفہ کا نام خطبہ میں پہلی بار پڑھا گیا ہے تو:

چندیں طبقہا پر از تنکہ زر و نقرہ بر آں نثار شد (برنی ص ۴۹۲)

اس سے معلوم ہوا کہ اشرفی کے لیے اس زمانہ میں تنکہ زر بولا جاتا تھا، خلجی کے زمانے میں ایک تنکہ زر یک تولہ سونے کا ہوتا تھا اور تنکۂ نقرہ ایک تولہ چاندی کا۔ (فرشتہ ص ۱۱۴) روپیہ کو تنکۂ نقرہ اور اس سے کم درجہ سکہ کو صرف تنکہ کہتے تھے یہ لفظ قدیم یادگار کے طور پر آج بھی بعض پرانے خاندانی مسلمانوں میں دین مہر کی تعیین میں بولا جاتا ہے

(دیکھو مولانا حالی کا خط بنام سید سلیمان ندوی در معارف)

خیال ہوتا ہے کہ یہی تنکہ تو آج "ٹکے" کی صورت میں ہمارے سامنے نہیں۔

دوسرا لفظ مہر زر ہے اس کو مہر اس لیے کہتے ہیں کہ اس پر شاہی نام نقش ہوتا تھا مہر زر کی اصطلاح برنی میں ملتی ہے۔

سلطان محمد مہر مس پیدا آورد فرمان داد کہ مہر مس خرید و فروخت چنانچہ مہر زر و نقرہ جاری ست (ص ۴۷۵)

یہی مہر زر اکبر کے زمانہ میں بھی زبان و قلم پر تھا، آئین اکبری میں اکبری سکوں کے بیان میں بھی یہ لفظ ملتا ہے (ص ۱۰) اگرچہ اکبر نے اشرفی کے لیے سہنسہ، رہس، آتمہ، جگل، لعل جلال، آفتابی وغیرہ بنائے اور چلائے، مگر مہر کا نقش بھی مٹا نہیں، بلکہ پرانی شاہی اشرفی

---

[1] مقدمہ ابن خلدون ص ۲۱۸۔

[2] ڈاکٹر تارا چند نے بتایا کہ تنکہ سنسکرت میں سکہ کو کہتے ہیں۔

کو آج بھی مہر کہتے ہیں۔

دکن میں آج بھی طلائی سکہ کا نام "ہیون" تھا، جو آخر میں مخفف ہو کر ہن رہ گیا، اور آج ہماری زبان میں اس نسبت سے دولت کی کثرت کے معنی میں "ہن برسنا" ایک یادگار رہ گیا ہے۔ روپیہ کا لفظ اور سکہ شیر شاہ کا چلایا ہوا ہے۔ (آئین اکبری ص ۱۸) اور عجب نہیں ہے کہ روپا سے بنا ہو! سونے کے سکے کے لیے اشرفی کا لفظ ہندوستان میں نورالدین جہانگیر کے زمانہ میں استعمال میں آیا ہے، چنانچہ فرشتہ نے اپنی تاریخ میں حسن گنگو بہمنی خزانہ پانے کی اتفاقی سرگذشت کے بیان میں لکھا ہے۔

زنجیر را در گردن ظرفے مملو از اشرفی علائی و طلائے غیر مسکوک دید

(فرشتہ نولکشوری ص ۲۷۴)

فرشتہ کی تصنیف کا زمانہ سنہ ۱۰۱۵ھ ۱۶۰۶ء سے سنہ ۱۰۳۳ھ ۱۶۲۳ء تک ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ گجرات و دکن کی راہ سے یہ اشرفی مسافرانہ ہندوستان وارد ہوئی ہے یہ عجیب بات ہے کہ سونے کے سکے کے لیے افریقہ کی طلاخیز اور زرریز زمین ہی سب سے زیادہ موزوں ثابت ہوئی ہے، انگریزی گنی کا مولد افریقہ کا ملک گانیا یا گینی قرار پایا ہے جس کو عرب غانہ کہتے ہیں اور بلاد التبر (سونے کا ملک) کے نام سے پکارتے تھے اور وہیں سے سونا لاتے تھے۔ وہم ہوتا ہے کہ غانہ کا تعلق عربی کے غنی اور غنا سے تو نہیں بہر حال ہماری اشرفی کا مولد و منشا بھی ہندوستان نہیں، بلکہ ایشیا بھی نہیں، افریقہ کا ہی ایک گوشہ ہے، مگر دوسری طرف کا یعنی مصر۔

مصر کے چرکسی بادشاہوں میں سے ایک برسبائی تھا۔ اس نے سنہ ۸۲۵ھ ۱۴۲۹ء سے سنہ ۸۴۱ھ ۱۴۳۷ء تک حکومت کی ہے اس کا شاہی لقب الملک الاشرف تھا یہی اشرف اشرفی کا مصدر و معدن ہے، مشہور عرب جہاز راں ابن ماجد اسد البحر نے جس نے سنہ ۹۰۴ھ (سنہ ۱۴۹۸ء) میں واسکوڈ گاما کو ہندوستان پہنچایا تھا۔ الفوائد فی اصول البحر والقواعد کے نام سے جہاز رانی پر ایک کتاب لکھی ہے جو چند سال ہوئے کہ فرانس سے چھپ کر شائع ہو چکی ہے، اس کا زمانہ نویں صدی ہجری کا اخیر اور دسویں صدی ہجری کا شروع تھا۔ یہ بحر ہند اور بحر عرب کا ایک نڈر جہاز راں تھا، گجراتی ہندو بیوپاریوں کی طرف سے اس کو کنکا کا سنسکرت خطاب ملا تھا، جس کے معنی ماہر ریاضی داں کے ہیں۔ (دیکھو میری کتاب عربوں کی جہاز رانی

ص ١٦٣ - ١٣٧) اس کی اسی کتاب کے مطالعہ سے اشرفی کا بھید مجھے معلوم ہوا۔ ابن ماجد ایک خاص سلسلہ میں لکھتا ہے

والحادی عشر برسبی الاشرف ضارب سکۃ الاشرفی (ص ۸۴ طبع پیرس)	گیارھواں بادشاہ برسبائی اشرف ہے جو اشرفی سکہ کا چلانے والا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اشرفی سکہ مصر سے چل کر بحر ہند میں داخل ہوا تھا۔ اور وہاں سے پورے ہندوستان میں پھیل گیا۔ ابن ماجد نے اپنی یہ کتاب سنہ ۸۹۵ھ ۱۴۸۹ء میں لکھی ہے اور اس سکے کے بانی کا ذکر کیا ہے۔ اور فرشتہ نے اپنی اصل کتاب اس کے بیس برس بعد سنہ ۹۱۵ھ میں لکھی اور "اشرفی علائی" کا نام لیا ہے یعنی علاء الدین خلجی کے وقت کی اشرفی، حالانکہ خلجی کے زمانہ میں اشرفی کا نام بھی پیدا نہیں ہوا تھا، مگر یہ ایسا ہی ہے جیسے ہم پرانے زمانے کے بادشاہوں کے سونے کے سکے کو یا انگریزی پونڈ کو اشرفی کہہ دیتے ہیں۔

بیمہ

روپے اور اشرفی کی تقریب سے وہ طریقہ یاد آیا جس سے قیمتی چیزیں محفوظ کر کے ایک شہر سے دوسرے شہر بذریعہ ڈاک بھیجتے ہیں جس کو ہم آپ بیمہ کہتے ہیں، خیال یہ تھا کہ یہ ڈاک کے نئے طریقوں میں سے ہے اور جہاں سے یہ نئے طریقے آئے ہیں وہیں سے یہ لفظ بھی بگڑ کر آیا ہے مگر اتفاق سے سجان رائے کی خلاصۃ التواریخ کا قلمی نسخہ نظر سے گذرا جو عالمگیر کے عہد کی تصنیف ہے۔ یہ سنہ ۱۱۰۷ھ ۱۶۹۵ء میں عالمگیر کی تخت نشینی کے چالیسویں سال مرتب ہوئی ہے۔

سجان رائے اہل ہند کی دیانت اور امانت داری کی دلیل میں یہاں کے مہاجنوں کے ذریعہ سے ترسیل زر کا حال لکھتا ہے، جس کا ترجمہ یہ ہے:

> لین دین میں یہاں کے لوگوں کی سچائی کا یہ حال ہے کہ کوئی کتنا ہی ناآشنا اور انجان ہو گواہی اور شہادت کے بغیر ہزاروں روپے امانت صرافوں کے حوالے کر دیتا ہے، یہ صراف بھی ایسے سچے ہوتے ہیں کہ جب ان سے امانت واپس مانگیے بلا حیلہ حوالہ کیے بے توقف واپس کر دیتے ہیں اور طرفہ یہ کہ اگر کوئی دور دراز راستوں کے ڈر سے اپنا نقد روپیہ اپنے ساتھ نہ لے جا سکے تو وہ ان کے حوالہ کر دیتا ہے، یہ دیانت دار صراف ان روپیوں کو اپنی تحویل میں لے کر ہنڈی میں اپنے کارندوں کے نام جو ہر شہر میں ان کی طرف سے سچائی

کی دوکان کھولے رہتے ہیں ایک پرچہ لکھ کر دیدیتے ہیں اس کو یہاں کی زبان میں ہنڈی کہتے ہیں، یہ کارندے اگرچہ سیکڑوں میل کی مسافت ہو اس پرچہ کو دیکھنے کے ساتھ بلاحجت اس کو روپیہ دیدیتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ اس پرچہ کو جو کاغذ کے ایک ٹکڑے سے زیادہ نہیں ہے، اگر مقررہ مقام کے علاوہ مالک کسی دوسری جگہ بیچنا چاہے تو اتنے ہی روپے اس کو فوراً مل جائیں گے، صرف یہ ہوگا کہ خریدنے والا تھوڑا کمیشن (تمتّع) اس سے لیگا۔

اب اس کے بعد اصلی فقرہ آتا ہے:

"عجب تر آنکہ اگر تاجران بسبب طرق بالمہ اقمشہ و امتعہ و دیگر اموال آنہا بجنس در قرارگاہ سلامت رسانیدہ بمالکان عائد می نمایند و آں را بزبان ایں ددم بیمہ گویند۔"

"اس عبارت سے یہ معلوم ہو گیا کہ پرانے ہندوستان میں منی آرڈر بھیجنے، بینک کا چیک استعمال کرنے اور قیمتی چیزوں کو ہمیشہ کسی دوسری جگہ بیمہ کرکے بھیجنے کا کیا طریقہ تھا اور اس سے لفظ بیمہ کی قدامت کا حال بھی معلوم ہوا۔"

"بزبان ایں ددم بیمہ گویند" سے خیال ہوتا ہے کہ کوئی ہندی یا سنسکرت کا لفظ ہوگا، مگر میں نے ہندی اور سنسکرت کے عالموں سے اس کی تحقیق چاہی تو کوئی اس کا پتہ نہ بتا سکا، اس سے وہم ہو جاتا ہے کہ یہ فارسی لفظ بیم بمعنی خوف سے نہ لیا گیا ہو۔ سجان رائے نے اس بیان کا آغاز بھی ان لفظوں سے کیا ہے:

"و طرفہ آنکہ اگر بنابر خوف مسالک ممالک شخصے مبلغہائے نقد بمسافت دور و نزدیک نتواند برد۔"

اس لفظ خوف سے بھی ادھر ہی خیال جاتا ہے، مگر مشکل یہ ہے کہ فارسی لغت کی کتابوں میں یہ لفظ نہیں ملتا۔ انیسویں صدی عیسوی کے آخر میں سید تصدق حسین نامی ایک بزرگ نے لغات کشوری کے نام سے ایک فارسی لغت منشی نولکشور صاحب کے نام سے لکھا ہے اور نول کشور پریس میں سنہ ۱۹۰۰ء میں چھپا ہے، مؤلف نے مقدمہ میں یقین دلایا ہے کہ تمام لغات دیکھ کر بڑی احتیاط سے یہ لغت لکھا گیا ہے۔ اس میں بیمہ کے لفظ کے نیچے اس کو فارسی بتا کر یہ تشریح لکھی ہے:

"بخوف رہ زنی جو کسی ساہوکار کو محصول کسی نقد یا مال کے پہنچانے کا دیں اور وہ اس کی حفاظت کا ذمہ دار ہو۔"

لغات کشوری کی امانت و دیانت کا اگر اعتبار کیا جائے تو پھر بیمہ کے فارسی ہونے میں کوئی شبہ نہیں رہ جاتا۔

ڈاک

بیمہ کے ذکر سے سب کا خیال ڈاک، ڈاکخانہ اور ڈاک گھر کی طرف چلا گیا ہوگا، موقع ہے کہ آپ کے اس حسن التفات سے ہم فائدہ اٹھائیں، تعجب ہوگا کہ اس ڈاک کا ہمارے لغت میں پتہ نہیں۔

عربی میں ڈاک کے لیے برید کا لفظ استعمال ہوتا ہے، مسلمانوں میں امیر معاویہ نے سب سے پہلے اس نظام کو قائم کیا، اور برید اس کا نام پڑا، ہمارے عجمی اہلِ لغت نے اس کو فارسی بریدن سے لیا اور بتایا کہ چونکہ ڈاک کے لیے دم بریدہ یعنی دم کٹے گھوڑے کام میں لائے جاتے تھے اس لیے ڈاک کو برید کہنے لگے، حالانکہ اگر یہ اشتقاق درست بھی ہوتا تو زیر کے بجائے ب کو پیش ہونا چاہیے تھا۔ اب نئی تحقیق یہ ہے کہ یہ یونانی اور لاطینی سے عربی میں آیا ہے اور وریڈا اس کی اصل ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے ساتھ پہلے یہی لفظ آیا، پھر ترکی لفظ اولاغ چلا۔ (برنی ص، ۴۴ کلکتہ) مگر فوراً ہی اس کی جگہ ایک ہندوستانی لفظ نے رواج پایا اور وہ لفظ دھاوا ہے، چنانچہ تغلقوں کی تاریخ میں یہ لفظ بولا گیا ہے۔ ابن بطوطہ نے سفرنامہ میں بعینہٖ یہی لفظ لکھا ہے (۲ص ۱ مصر) برنی نے فیروز شاہی میں اس لفظ کا استعمال کیا ہے (ص، ۴۴ کلکتہ)

مگر اس کو دھاوا کیوں کہتے تھے، اس کا پتہ اپنوں سے نہیں بلکہ ابن بطوطہ جیسے بیگانے سے چلتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ دھاوہ کے معنی اہل ہند میں تہائی میل کے ہیں، چونکہ یہ سرکارے ہر تہائی میل پر مقرر ہوتے تھے اس لیے اس کو دھاوا کہتے تھے اور استعمال سے راستے کے بجائے خود راستے والے پیادے کو دھاوا کہنے لگے، لیکن غریب ناآشنا سے زبان کو اس میں غلط فہمی ہوئی ہے۔ دھاوے کے معنی سنسکرت میں دوڑنے کے ہیں، چونکہ یہ دوڑ کر چلتے تھے اس لیے ان کی چال کو دھاوا کہنے لگے، پھر خود دھاوا ہو گئے اور ہر

تہائی میل پر جہاں ٹھہرتے تھے، وہ دھاوا[1] ہو گیا۔ دھاوے کے ان پیادوں کی چوکیاں ہر تہائی میل پر دلی سے لے کر دولت آباد تک بنی ہوئی تھیں، پیادہ گھنگھرو دار لاٹھی کو کندھے پر رکھ کر تیزی سے دوڑتا ہوا اگلے دھاوے تک پہنچتا تھا وہاں دوسرا پیادہ گھنگرو کی آواز سن کر تیار رہتا تھا۔ وہ فوراً اس سے ڈاک لے کر آگے کے دھاوے کو دوڑتا تھا اس طرح سندھ سے دلی ۵ دن میں ڈاک پہونچتی تھی (ابن بطوطہ)

اس دھاوے کی یادگار ہماری زبان میں دھاوا کرنا۔ دھاوے پر چڑھنا۔ دھاوا بول دینا آج بھی موجود ہے اور دھاوے کے پیادے کو پایک کہتے تھے جو پیک کی صورت میں محرم کی تقریب میں امام کے نقلی قاصدوں کا ہم نے نام رکھا ہے۔

مگر معلوم ہوتا ہے کہ آل تیمور نے جب ہندوستان پر دھاوا کیا تو یہ لفظ یہاں سے مٹ چکا تھا، چنانچہ اکبر کے زمانہ میں جب بدایونی نے اس لفظ کو استعمال کیا تو اس کو اس ترجمہ کی ضرورت ہوئی۔ سلطان محمد تغلق کے حال میں کہتا ہے:

> "در سنہ ۷۲۷ھ سلطان محمد تغلق عزیمت دیوگیر کردہ از دہلی تا آنجا بر سر کروہے دھاوا یعنی پایکاں خبردار نشاندہ۔"

فرشتہ نے جہانگیر کے زمانے میں اپنی کتاب لکھی تو دھاوا کا لفظ مٹ کر ڈاک چوکی کا لفظ پیدا ہو چکا تھا، مگر کہتا ہے کہ اس کو پہلے (ی،م) کہتے تھے۔ سلطان علاؤالدین کے حال میں لکھتا ہے:

> "از دہلی تا آنجا ڈاک چوکی کہ بزبان سلف یام می گفتند می نشاندہ۔"

یہ یام فارسی استعمال میں ہے، لیکن مدراس سے لے کر پونا تک اس کے لیے ٹپہ ٹپال بولتے ہیں بولا جاتا ہے۔ ریاست حیدرآباد کا سرکاری لفظ یہی ہے۔

بہرحال ڈاک کا لفظ جہانگیر کے زمانہ میں یا اس سے پہلے سے بولا جانے لگا۔ اس کی اصلیت پر میں غور کرتا رہا ہوں، میرا خیال ہے کہ اس کے معنی منزل کے ہوں گے۔ چونکہ یہ منزل بہ منزل جاتے تھے اس لیے اس کو ڈاک کہنے لگے اور اس کے ہر پڑاؤ کو ڈاک چوکی

---

[1] مولوی غلام مصطفیٰ خاں لکچرر ایڈورڈ کالج امراوتی مطلع فرماتے ہیں کہ برار میں دھاوے کے معنی دو منزلہ مکان کے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ چوکیاں دو منزلہ ہوتی ہوں۔

چوکی معنی پہرہ جس کی ایک یادگار چوکیدار ہمارے پاس موجود ہے۔ اسی لیے انگریزوں نے اسی اصول سے بنگال سے الٰہ آباد تک اپنے منزل بہ منزل سفروں کے لیے جو مختصر قیام گاہیں بنائیں ان کو ڈاک بنگلہ کہا اور اب بھی وہ یہی کہے جاتے ہیں اور اگر لغت گھڑنے کا الزام نہ قائم کیا جائے تو جی چاہتا ہے کہ یہ کہوں کہ ہندوستان و افغانستان کی سرحد پر ڈکہ اور بنگال کی سرحد پر ڈھاکہ اور دوسری طرف موتی ہاری سے نیپال کے پاس دوسرا ڈھاکہ اسی منزل گاہ کے باقی نشان ہیں۔ بہرحال منزل نے راستے کی اور راستے نے خط و لفافہ اور اشیائے ڈاک کی صورت اختیار کی، اور اب وہ ڈاک کے پچھلے معنی کی صورت ڈاک بٹھانا، ڈاک لگانا، یعنی جلدی جلدی منزل بمنزل یا ہاتھوں ہاتھ چیزوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانا رہ گیا ہے۔

فیض ساقی نے مرے ڈاک لگا رکھی ہے (راسخ)

روح ہے ہر جسم میں مشتاق اخبار اجل
اس لیے یہ آمد و رفت نفس کی ڈاک ہے (ناسخ)

اسی سے ڈاک بولنا بھی ایک محاورہ ہے، یعنی نیلام میں منزل بمنزل کسی چیز کی قیمت بڑھانا

کچھ دن ہوئے ایک قلمی ہندوستانی فارسی لغت برادرم پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی (اسماعیل کالج بمبئی) کے پاس نظر سے گزرا یہ لغت کسی ایرانی یا پارسی نے لکھا ہے تالیف کا سنہ نہیں معلوم اس میں ایک لفظ ڈانکیہ دیکھا جس کے معنی نقیب کے لکھے ہیں نقیب شاہی درباروں میں درباریوں کو باادب رہنے کے لیے زور سے آواز لگایا کرتے تھے۔ ڈانکنا کے معنی زور سے آواز لگانے کے ہیں اس سے دوسرا خیال یہ ہوتا ہے کہ ڈاک کی اصل ڈانک اور ڈاکیہ کی ڈانکیہ ہے، چونکہ ڈاک کا چوب دار آواز دیتا ہوا چلتا تھا اس لیے اس کو ڈانکیہ اور اس کے کام کو ڈانک کہا گیا اور ڈانک نے ڈاک کی صورت بدل کر منزل بمنزل رفتار کے معنی اختیار کر لیے۔

اگلے زمانہ میں مصر وغیرہ اور ہمارے ملک میں بھی جہانگیر نے ڈاک کے کبوتر اڑا دیے تھے، اس لیے ایک اڑتی سی بات کبوتر ہی سے ملتے جلتے پرندے کی نسبت سن لیجیے

قمری

ہماری زبان میں ایک خوش نوا پرندے کا نام قمری ہے، یہ نام عربی و فارسی سے آیا ہے مگر اس کی اصلیت کے بتلانے سے یہ دونوں زبانیں قاصر ہیں، فارسی کے خالص لغتوں میں یہ لفظ سرے سے نہیں، مویدالفضلا میں جو عربی آمیز فارسی الفاظ کا پرانا لغت ہے۔ یہ لفظ ملتا ہے۔ اور تاج نام کسی حوالے سے لکھا ہے کہ فاختہ کو کہتے ہیں، پھر اس سے اختلاف کیا ہے کہ فاختہ اور چڑیا ہے اور قمری اور فاختہ کا رنگ خاکستری ہوتا ہے اور اس کی آواز یکے تو یا کوکو کی ہوتی ہے، گلے میں طوق ہوتا ہے اور قمری کی دو قسمیں ہوتی ہیں ایک سفید کافوری اور دوسری صندل، اور اس کی آواز سے یا غفور کی صدا نکلتی ہے۔

تاج کے مشہور نام سے تو جوہری کی تاج اللغہ کی طرف خیال جاتا ہے، اس میں شک نہیں کہ جوہری نے قمری کا ذکر کیا ہے، مگر یہ نہیں لکھا ہے کہ فاختہ کو کہتے ہیں، بہرحال یہ لفظ فارسی نہیں ہے عربی بھی نہیں، کیونکہ اول تو عرب اس سے واقف نہ تھے، ان کے شعروں میں اس کا ذکر نہیں، قدیم عربی لغت میں یہ مذکور نہیں، اس کی ساخت اصل عربی لفظ کی نہیں اس کے اخیر میں جو یائے مشدد ہے وہ نسبت کو ظاہر کرتی ہے اور اسی نسبت کی طرف اکثر اہل لغت گئے ہیں، جوہری کی تحقیق یہ ہے کہ یہ قمر سے مشتق ہے جس کے معنی سپیدی کے ہیں اور اس سے صفت بنی اقمر اس اقمر کی جمع ہوئی قمر، جیسے احمر سے حمر، اور اب یہ ہوا کہ سفید پرندوں کو جمع کر کے بول بولے طیر قمر، اب اس جمع کا واحد جب مراد ہوا تو جمع کی طرف یائے نسبت لے کر قمری واحد بنا لیا، جیسے روم سے رومی، زنج سے زنگ زنجی (زنگی) مگر اس تحقیق میں بڑی کھینچ تان معلوم ہوتی ہے، عربی میں اس محنت سے کسی اور پرندے کا نام نہیں رکھا گیا۔

مجد فیروزآبادی نے قاموس میں قمریہ لکھا ہے اور بتایا ہے کہ کبوتر کی ایک قسم ہے، مرتضٰی زبیدی بلگرامی نے تاج العروس میں لکھا ہے کہ مجد نے یہ محکم زمخشری سے لیا ہے بعضوں کا دعوٰی ہے کہ قمری عربی کا قدیم لفظ ہے، اس کی جمع قمر، ابوعامر نام ایک جاہل عرب شاعر کے کلام میں ہے۔

ما قرقر قمر الواد بالشاہق

مگر اس کا کوئی دوسرا شاہد نہیں۔

قمری کے آخر میں جو ی ہے، اس کو کوئی صاحب یائے مبالغہ سمجھتے ہیں، مگر اکثروں کی رائے یہی ہے کہ یہ یائے نسبت ہے اب رہی یہ بات کہ کس کی طرف نسبت ہے، تو بعض لوگ اس کو اس نام کے ایک پہاڑ کی طرف نسبت سمجھتے ہیں، اور بعض اس نام کے کسی مقام کا ذکر کرتے ہیں، علامہ مرتضیٰ زبیدی نے تاج العروس میں اوپر کی تفصیل بتا کر لکھا ہے کہ ان کے استاد نے شرح کفایہ میں اس کی تحقیق کی ہے۔

اب اہل لغت کے دربار سے اٹھ کر ہم آوارہ گرد جغرافیہ نویسوں کے مسافر خانوں میں پہنچتے ہیں، یاقوت رومی   البلدان میں قمر نام کے ایک مصری شہر کا ذکر کیا ہے اور ابن الفارس سے نقل کرتا ہے کہ قمری پرندہ اسی شہر کی طرف منسوب ہے   یزری خطط مصر میں دریائے نیل کے منبع کی تلاش میں نکلتا ہے اور بحر ہند کے جزیروں کو دیکھتا بھالتا جاتا ہے اور اسی اثنا میں جزیرۂ قمر کا ذکر کرتا ہے اور جس کا دوسرا نام جزیرۂ ملائی بتاتا ہے، جس کو آج ہم ملایا کہتے ہیں انہی میں سے ایک جزیرہ قمریہ بتایا ہے اور اس کے بعد کہتا ہے کہ:

والیہا ینسب الطائر القمری   اور اسی جزیرہ کی طرف قمری پرندہ منسوب ہے۔
(ص ۱۸ مصر)

البیرونی نے کتاب الہند میں ملایا کے کچھ جزیروں کا نام قمیر[1] بتایا ہے (ص ۱۰۳)

پرندوں کے نام ان مقاموں کی نسبت سے رکھنا جہاں پہلے پہل وہ پرندے کسی خوش مذاق کو ہاتھ آئے ہوں، عام بات ہے، ترکی، چینی، شیرازی وغیرہ اس کی مثالیں ہیں۔

اتنی مسافت طے کرنے کے بعد ذرا ستانے کے لیے "غالب" کے اس شعر کا مطلب حل کیجیے:

قمری کف خاکستر و بلبل قفس رنگ   اے نالہ نشان جگر سوختہ کیا ہے

فارسی شاعروں نے گل و بلبل کی طرح سرو و قمری میں محبت کا رشتہ جوڑا ہے۔

قمریاں پاس غلط کردۂ خود می دارند   ورنہ یک سرو درین بام باندام تو نیست

---

[1] ہمارے دوست تاراچند نے بتایا ہے کہ انگریزی و فرنچ میں کھیر Khmer کہتے ہیں۔

ایک اور یائے نسبت حل طلب ہے۔

سوسی

ہمارے ملک میں رنگین باریک دھاریوں کا ایک سوتی کپڑا ہوتا ہے، جس کو سوسی کہتے ہیں۔ اسلامی زمانہ کے اکثر بنے ہوئے کپڑے کے نام یا تو کاریگر کے نام یا مقام یا اس امیر یا بادشاہ کے نام یا اس کام کے نام پر رکھے جاتے تھے جو اس کپڑے میں خاص طور سے کیا جاتا تھا۔ جیسے تافتہ بافتہ، زری، کارچوبی وغیرہ۔ انگریزی میں ململ کو جو مسلین کہتے ہیں وہ موصل کی طرف نسبت ہے۔

سوسی نہ تو شخص کا نام ہے نہ ہندوستان کے کسی مقام کا، یہ تو ظاہر ہے کہ اس کی نسبت سوسی کی طرف ہے سوس کے نام سے ایک شہر ترکستان میں ہے اور دوسرا مغرب اقصیٰ یعنی ملک مراکش میں ہے مگر یہ دونوں پارچہ بافی سے کوئی نسبت نہیں رکھتے لیکن ہے یہ دافعی شمالی افریقہ کے ایک صنعتی مقام کا نام۔ اس کا نام سوسہ ہے، یہ عربوں کی ترقی کے عہد میں پارچہ بافی کا بڑا مرکز تھا، اور یہاں کے بنے ہوئے کپڑوں کو سوسی کہتے تھے پھر اس نمونہ پر جہاں جہاں کپڑے بنے جانے لگے ان کو سوسی ہی کہنے لگے۔ یہ گویا ایک طرز کا نام ہو گیا۔ یہ کپڑے کبھی اس شان کے بنے جاتے تھے کہ ان کے ایک ایک تھان کی قیمت آٹھ آٹھ اشرفی ہوتی تھی۔ جغرافی ڈکشنری معجم البلدان کا مصنف یاقوت حموی کاردی جس نے سنہ ۶۲۶ھ ۱۲۲۹ء میں وفات پائی ہے۔ سوسہ کے ذکر میں لکھتا ہے

> لفظ سوسہ: (صحیح یہ ہے کہ سوسا ایک چھوٹا شہر افریقہ کے اطراف میں ہے....
> ...یہاں کے اکثر باشندے کپڑا بننے والے ہیں۔ یہ بیش قیمت (یا باریک) (یا باریک) سوسی کپڑے بنتے ہیں اور جو کپڑا دوسری جگہوں پر ویسا بنا جاتا ہے، وہ ان ہی کی نقل ہے۔ (یا ان ہی کے مشابہ ہے) ان میں سے ایک تھان کی قیمت دس دینار ہے..... اور جو دھاگا وہاں کتتا ہے اس کے ایک مثقال کی قیمت دو مثقال سونا ہے،

لیکن ہماری ہندوستانی سوسی بہت سستی ہے اور غریبوں کی ستر پوش ہے۔ اکثر غریب عورتوں کے پاجاموں میں کام آئی ہے۔ چیز وہ نہیں رہی طرز وہی ہے، وہ ریشمی ہوگی یہ سوتی ہے۔

ایک مجہول یائے نسبت ہمارے خوش ذائقہ کھانوں میں بھی ہے۔

فیرنی

یہ ہمارے کھانے کی ایک لذیذ قسم ہے جس کے مزے سے ہم سب واقف ہیں، مگر اس کی لفظی اصلیت سے ہم سب ناواقف ہیں۔ پتہ یہ چلتا ہے کہ فیرنی اصل میں فُرنی (بالضم) ہے۔ چوتھی صدی کا مصنف محمد خوارزمی جو غزنویوں کا معاصر تھا، اپنی کتاب مفاتیح العلوم (ص ۱۶۶ لیڈن) میں بیماروں کی غذاؤں کے سلسلہ میں فرانی نام لیتا ہے اور کہتا ہے کہ اس غذا کی تیاری کی صورت یہ ہے کہ وہ مختلف شکلوں کی موٹی تنوری پھولی ہوئی (پاؤ روٹی سمجھیے) روٹی کو دودھ میں بھگو کر شکر ڈال کر تیار کی جاتی ہے۔ (نان بہ شیر کہیے) اس کا واحد فرنی ہے۔ اس کو فرنی اس لیے کہتے ہیں کہ یہ موٹی روٹی تنور میں جس کو عربی میں فرن کہتے ہیں، تیار ہوتی ہے گویا تنوری کو فرن کے معنی میں سمجھیے۔ ہندوستان کا اثر یہ ہے کہ موٹی پھولی ہوئی روٹی کے بجائے اس میں چاول ڈالنے لگے، اور اب شکر قند ہو۔ سابو دانہ ہو، جس چیز کو آپ دودھ شکر میں پتلا کرکے بنائیں وہ فرنی ہے، مگر اسی کے ساتھ اتنی اور ترمیم کیجیے کہ ف کو پیش کی جگہ زیر دیجیے۔

یہی مصنف ہمارے بھارت کا ذکر ایسے لفظوں میں کرتا ہے جن سے کھیر کی خوشبو آتی ہے، وہ کہتا ہے بھتہ (بھط) سندھی لفظ ہے۔ چاول میں گھی اور دودھ ڈال کر بناتے ہیں، کھیر اور شیر (دودھ) ایک ہی چیز ہے، سنسکرت میں دودھ کو کشیر اور سندھی میں کھیر کہتے ہیں، جس سے ہماری یہ کھیر پکتی ہے اور اسی لیے کھیر کہلاتی ہے، بھات سے بھاتی کا لفظ نکلا ہے جو میت کے کھانے کو کہتے ہیں، کیوں صاحبو انگریزی ملازموں کا بھتہ اسی بھات سے تو نہیں ہے، جس کا آغاز بنگال کے انگریزی نوکروں سے ہوا اور اس کے معنی خرچ خوراک کے ہیں۔ ۱۷۶۵ء ۱۷۶۷ء میں لارڈ کلایو نے جو اصلاحات کیں ان میں ایک یہ بھی ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی سپاہیوں کو تنخواہ کے علاوہ بھتہ دیا کرتی تھی، کلایو نے اس زمانہ میں اس کو بند کر دیا۔ اس واقعہ سے بھی اس لفظ کا اصل تعلق بنگال سے ثابت ہوتا ہے۔

رقم

اس بھتہ سے لوگوں کو اچھی خاصی رقم ہاتھ آتی ہے، کبھی آپ دوسروں کے ذمہ اپنی رقم نکالتے ہیں اور کبھی دوسرے آپ کے ذمہ، مگر کبھی آپ نے یہ سوچا کہ "رقم" آپ کو

کہاں سے ہاتھ آیا؟ آج ہم رقم روپیے کی ایک مقدار کو کہتے ہیں، رقم کا لفظ یقیناً عربی ہے، مگر اس معنی میں نہ عربی میں مستعمل ہے، نہ فارسی میں، بلکہ یہ خاص ہندوستانی ہے رقم کے معنی عربی میں نشان بنانے کے اور کپڑے کی دھاری کے ہیں۔ حدیث میں ہے، الارقمانی ثوب اس سے لکھنے کے معنی ہوئے جیسے کالرقم علی الماء عربی میں حساب اور ریاضیات کی کتابوں کے ترجمے ہوئے تو عدد کے نشان کے لیے رقم کا لفظ پسند کیا گیا اور اس پسندیدگی کی وجہ شاید یہ ہے کہ رقم اور قلم ایک قافیہ کے لفظ ہیں، اور قلم خط یا اسکرپٹ کے معنی میں استعمال ہو چکا تھا، اس لیے اسی کے وزن کا لفظ رقم اعداد کے لیے مناسب معلوم ہوا، جمع کے قلام اور ارقام بولے جاتے تھے۔ بیرونی نے کتاب الہند میں خطوط اور ارقام استعمال کیا ہے، (ص ۸۷) اسی سے اعداد کے علامات خصوصاً روپئے کے اعداد کے علامات کے لیے جو خاص ہندوستان کی چیز ہے ارقام ہندیہ مستعمل ہوا اور جب حساب کی اصطلاح میں ارقام اور رقم کا لفظ آگیا تو نقد روپیہ کے لیے اس کا استعمال پا جانا کتنی بڑی بات تھی۔

ہندسہ

رقم سے ہندسہ کی طرف خیال گیا چونکہ ارقام ہند سے عربی میں لیے گیے ہیں اس لیے عوام ہندسہ کو زیر کے بجائے زبر دے کر ہندسہ بولتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ چونکہ یہ ہند سے ہے، اس لیے ہندسہ ہے اور تعجب ہے کہ خوارزمی کے الجبر و المقابلہ کا انگریزی مترجم فریڈرک روزن تک اس وہم میں مبتلا ہے (ص ۱۹۶، ۱۹۷ مقدمہ انگریزی سنہ ۱۸۳۱ء) فارسی لغت برہان قاطع کے مصنف بھی اسی غلطی میں گرفتار ہیں، کہتے ہیں:

> ہندسہ بکسر اول و ثالث و فتح سین بے نقطہ بمعنی اندازہ و شکل باشد و ارقامے را نیز گویند کہ در زیر حروف کلمات نویسند ہمچو ابجد ہوز حطی،

---

[1] افسوس ہے کہ میری کتاب عرب و ہند کے مصحح نے اپنی غلط تصحیح سے صحیح کو غلط کر دیا ہے۔ (دیکھو کتاب مذکور ص ۱۴۵)

یہ بیان تمام تر غلط در غلط ہے ہندسہ بفتح اول و ثالث و رابع بروزن فعللہ فارسی لفظ انداز کا عربی بنایا ہوا مصدر ہے، معنی اندازہ کرنا اور اس سے مراد عمارت کا ناپنا اور نقشہ بنانا یعنی فن تعمیر ہے جس کو آج انجینرنگ کہتے ہیں، بعضوں نے اس کو فارسی اندیشہ کا معرب بنایا ہے، مگر یہ صحیح نہیں، خوارزمی (چوتھی صدی) مفاتیح العلوم میں کہتا ہے

الهندسة كلمة فارسية معرب
و فی الفارسیة اندازه ای المقادیر
قال الخلیل المهندس الذی یقدر مجاری
القنی و مواضعها حیث تحتفر وهی مشتقة
من الهندزة فارسیة فصیرت الزای سیناً
لانه لیس بعد الدال زای فی کلام العرب

(ص ۲۰۲ میدان)

لیکن ہندسہ تو یہ فارسی لفظ کا معرب ہے فارسی میں اندازہ ہے، یعنی مقدار، خلیل نے کہا ہے کہ مہندس وہ ہے جو نہروں کے نکلنے کا اندازہ و پیمائش کرتا ہے تاکہ نہریں کھودی جائیں۔ اور ہندزہ سے بنا ہے اور وہ فارسی ہے، تو ز کی جگہ س نے لی ہے، کیونکہ عربی میں دال کے بعد ز نہیں ہے۔

ریاضیات

ہندسہ سے ریاضیات کی طرف ذہن نے کروٹ لی، عربی میں روض کے دو معنی ہیں، زمین کی سرسبزی و شادابی اس نے باغ و بہار کا مفہوم پیدا کیا اور ریاض جنت کے پھول کھلائے، دوسرا مفہوم سواری کے جانوروں کے اور خصوصاً گھوڑے کے سدھانے سکھانے اور پھیرنے کا ہے، عربی میں فعالہ کا وزن پیشہ فن اور صنعت کے کام آتا ہے اس سے ریاضہ بن کر گھوڑ پھیرنے کا فن یا پیشہ پیدا ہوا، گھوڑے کو پھیر کر سیدھا اور شائستہ بنانے سے صوفیا نے نفس کو رام کر کے شائستہ بنایا اور ریاضت روحانی اس کا نام رکھا۔ ادھر گوشت و پوست اور جوڑ بند کے حسن کے شائقوں نے جسمانی مشق و ورزش کو ریاضت جسمانی کہا، اہل علم کیوں چپ رہتے، انھوں نے حساب و ہندسہ وغیرہ مشقی علوم کو ریاضیات کا خطاب دیا۔ جاہل اہل پیشہ نے کہا کہ ہم کو بھی اپنے کاموں میں محنت کم نہیں پڑتی، انھوں نے بھی اپنی صنعت کاری اور دیدہ ریزی کا نام ریاض رکھا، لیکن اس معنی میں یہ خالص ہندوستانی ہے۔

عرب حکیموں نے ریاضیات کو ریاضیات کا لقب کیوں دیا؟ جبکہ ریاضیات کی یہ خصوصیت نہیں۔ ہر فن مشق کا محتاج ہے، اصلیت یہ ہے کہ ہندیوں کی طرح

یونانیوں میں بھی بچوں کی تعلیم کا آغاز ریاضیات سے ہوتا تھا اسی لیے جب شروع شروع میں عربی میں یونانی علوم آئے تو ریاضیات کا نام تعلیمیات پڑا، کیونکہ تعلیم کا آغاز اسی سے ہوتا ہے، اب عربی فلسفہ میں اس اصطلاح کا اثر اتنا ہی رہ گیا ہے کہ مقدار مطلق کا نام اس میں اب بھی جسم تعلیمی ہے، لیکن تعلیمات کی جگہ بہت جلد اس سے بہتر لفظ ریاضیات نے لے لی اس لیے بچوں کی مشقی تعلیم اسی سے شروع ہوتی ہے۔

علامہ شریف جرجانی اپنی تعریفات میں جسم تعلیمی کے نیچے لکھتے ہیں:

وَیُسَمّٰی جِسمًا تعلیمیًا اذ یُحبث عنہ فی العلوم التعلیمیہ ای الریاضیہ...... منسوبۃ الی التعلیم والریاضیہ فانہم کانوا یبتدؤن بہا فی تعالیمہم وریاضتہم لنفوس الصبیان۔

سیاست

ریاضت کے وزن پر سیاست ہے اور آج کل کا کیا کہنا کہ ساری دنیا میں اسی کی بہار ہے، مگر معلوم ہے کہ اس کی اصلیت کیا ہے؟ لغت میں اس کے اصلی معنی جانوروں کی دیکھ بھال اور نگرانی ہے اور اسی سے امیر کی اپنی جماعت کی اور بادشاہ کی اپنی رعایا کی نگرانی اور خدمت کا مفہوم پیدا ہوا، ظالم بادشاہوں کے ظلم نے اس کے معنی بدل دیے اسی سے سیاسی کردن، سزا دینے کے اور اردو میں قہر و غضب کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

عوض اللہ اس کا محکمہ میں حشر کے لے گا

کرے گا جو سیاست حاکم ظالم رعیت پر (صبا)

سیاست کے لفظ کو یہاں ذکر کرنا کچھ اتنا ضروری نہ تھا، مگر مجھے پروفیسر ٹی۔ ڈبلیو آرنلڈ (ماسوف علیہ) کی تحقیق سے اختلاف مقصود تھا، سوار السبیل فی معرفۃ المولد والدخیل میں وہ کہتے ہیں کہ سیاست ترکی سے ہے، چنگیز خاں نے اپنی اولاد کے لیے جو چند ملکی قاعدے بنائے تھے، ان کا نام "سہ یاسہ" تھا اسی سے عربی میں سیاست آیا ہے، مگر یہ خیال قطعاً غلط ہے، یہ لفظ عربی میں اتنا پرانا ہے کہ حدیث تک موجود ہے۔ ان الناس کان یسوسہم الانبیاء (صحیح مسلم) پہلی صدی ہجری کے آخر یہ

محمد بن قاسم نے جب "سترہ" برس کی عمر میں سندھ فتح کیا تو ایک شاعر نے اس کی مدح میں کہا:

ساس الرجال لسبع عشرۃ حجۃ   اس نے ۱۷ برس کی عمر میں لوگوں کی سیاست کی

ابن ندیم نے فہرست میں جو ۳۷۵ھ میں تاتاریوں سے صدیوں پہلے لکھی گئی سیاسیات کا لفظ سیاسی ملکی کتابوں کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ پھر قدیم کتب لغت میں اس کی اصل موجود ہے۔

ہاں اپنی زبان کے تعلق سے یہ کہنا رہ گیا، کہ ہماری زبان میں سائیس اور سئیس کا لفظ اسی سیاست سے بنا ہے۔ اس کی اصل سائس ہے مگر پیشے اور نوکری کے لحاظ سے سائیس کا یہ مفہوم خالص ہندوستانی ہے، نہ عربی ہے، نہ فارسی، مگر شوخی معاف، آپ نے یہ دیکھا کہ سیاسی اور سئیس دونوں کی اصل ایک ہی ہوئی۔ دونوں نگرانی اور نگہبانی کرتے ہیں، سیاسی آج کل جس کو کہتے ہیں، ہمارے تازہ دکھنی نوجوانوں نے اس کے لیے سیاس کا ایک نیا لفظ گھڑا ہے، مگر بالکل بے اصل اور بے قیاس ہے، یہ لفظ واوی ہے یائی نہیں، دھوکا سیاست اور سیاسی کی "ی" سے ہوا ہے، مگر واو کی جگہ یہ ی قاعدے سے ہے اور سیاس میں واؤ کی جگہ ی بے قاعدہ ہے۔ اگر یہ لفظ بن بھی سکتا تو سواس ہوتا، سیاس نہیں، اب یہ سیاس جب تک چل نہ جائے۔ غلط العام فصیح کے حکم میں نہیں آسکتا۔

بحث سیاسیات کی خطرناک الجھنوں میں پڑ کر خطرناک ہو رہی ہے اس لیے خاموشی ہی بہتر ہے۔

(۲)

لیکن کافی غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ اب سیاسیات وہ پہلے کے سیاسیات نہیں رہے۔ اب یہ سننے میں آتا ہے کہ سیاسیات کا اصلی میدان لاکھوں مربع میل کا وہ میدان نہیں ہے جس کو اگلے لوگ سلطنت و حکومت کہتے تھے۔ بلکہ یہ دو بالشت کا پیٹ ہے اسی کی خاطر سب کچھ ہے۔ اگلے زمانے کے بھولے بھالے بزرگ کہا کرتے تھے:

خوردن برائے زیستن است، نہ زیستن برائے خوردن۔

یعنی کھانا جینے کے لیے ہے نہ کہ جینا کھانے کے لیے۔

حضرت مسیح کہتے تھے. کہ" آدمی روٹی ہی سے نہیں جیتا. لیکن آج کل کی سیاسیات نے ان دونوں مقولوں کو جھٹلا دیا ہے. اب یہ ہے کہ جینا کھانے کے لیے ہے، نہ کھانا جینے کے لیے اور یہ کہ آدمی روٹی ہی سے جیتا ہے.

چنانچہ آج کل کے بولشزم، کمیونزم، سوشلزم وغیرہ کی بنیاد زمین پر نہیں پیٹ پر ہے۔

پیٹ کے کھانوں میں سب سے ضروری کھانا کون سا ہے؟ لوگ اپنے اپنے تجربے اور عادات کے مطابق اس کے کئی جواب دے سکتے ہیں، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ جو میرا خیال ہے وہی اکثروں کا ہے. یعنی یہ کہ کھانوں میں سب سے زیادہ ضروری کھانا ناشتہ ہے، صبح سویرے اٹھ کر منہ میں کچھ پڑ جانے سے سارے دن کے لیے ڈھارس ہو جاتی ہے۔

یہ عجیب بات ہے کہ ناشتہ کے لیے اکثر زبانوں میں بھوک توڑنے کی اصطلاح بن گئی ہے. میں دو زبانیں جانتا ہوں ایک پورب کی اور ایک پچھم کی، یعنی عربی اور انگریزی دونوں میں یہی بات ہے اس سے سمجھتا ہوں کہ اور زبانوں میں بھی کچھ ایسا ہی حال کا گا. عربی میں اس کو فطور کہتے ہیں اسی سے مسلمانوں کا افطار نکلا ہے، اور جس سے افطار کریں اس کو افطاری کہتے ہیں، فطور کے معنی توڑنے کے ہیں یعنی روزہ کی بھوک کو توڑنا، ہمارا ناشتہ بھی اسی قسم کا لفظ ہے فارسی میں اس کے معنی بھوک کے ہیں جس نے صبح سے کچھ نہ کھایا ہو (مؤید الفضلاء و برہان قاطع) اب دیکھیے کہ یہ نام تو اس آدمی کا تھا جس کے منہ میں صبح سے کچھ نہ پڑا ہو، اور اب ہم اس چیز کو کہتے ہیں، جو صبح سویرے ایسے آدمی کو کھلا دی جائے. یعنی شخص کے بجائے چیز کا نام ہو گیا۔

اس معنی میں ایک اور لفظ نہار آپ بولتے ہیں، نہار منہ، یہ بھی فارسی ہے، مگر دیکھیے کہ یہ فارسی ہندوستانی سے ایسا مل گیا ہے کہ گویا ہندوستانی ہی ہے اس کی اصلیت "ناہار" ہے. نا نفی کے لیے ہے اور ہار کے معنی غذا کے ہیں "ناہار" یعنی نہیں کھایا ہوا (برہان قاطع) اب اس سے ناہاری یعنی نہاری تیار ہوئی، جو صبح کو نہار منہ کھائی جائے اور لکھنؤ اور دلی میں یہ خاص چیز ہو گئی. جو بازاروں میں

پکی پکائی چٹ پٹ ملتی ہے۔

نہار سے آبار یاد آیا، آبار آٹے کی اُس لیٹی کو کہتے ہیں جو کاغذ اور کپڑے پر اس لیے چڑھائی جاتی ہے کہ وہ مضبوط ہو جائے۔ آپ سن چکے کہ آبار غذا کو کہتے ہیں، جو بدن کی تقویت کا باعث ہوتی ہے اسی سے اس لیٹی کو بھی کہنے لگے جو کاغذ اور کپڑے کی قوت کو بڑھا دیتی ہے (برہان قاطع)

ناشتے کے طور پر جلدی جلدی جو کھانا پہلے تیار کر کے مہمان کے سامنے رکھ دیا جائے، عربی میں اس کو سلفہ کہتے ہیں، اسی سے سلف (اگلے لوگ، کا لفظ نکلا ہے، عربی کا یہ سلفہ ہمارے ملک میں کھانے کے دستر خوان پر تو بار نہ پا سکا، مگر پینے کی یارانہ محفل میں ایک ہزار برس کے بعد اس کو جگہ مل گئی، نورالدین جہانگیر کے زمانہ میں تمباکو امریکہ سے ہندوستان آیا اور حکیم گیلانی کی پر حکمت ترکیبوں سے توا چلم حقہ اور نَے کی شکل پیدا ہوئی، یہ تو امیروں کی باتیں تھیں، اس حقہ کی تیاری کیلیے بڑا وقت بڑا سامان اور ایک دو ملازم چاہئیں اور غریبوں کے پاس نہ اتنا وقت نہ اتنا سامان، نہ ملازم، انھوں نے اپنے ہاتھ سے بھر کر سلفہ جلدی جلدی تیار کر لیا اور پی پلا کر اپنے کام پر روانہ ہو گئے۔

تکلف کے کھانوں میں قابوں میں نکالتے ہیں، عربی میں لفظ قعب ہے اس کے معنی لکڑی کے پیالہ کے ہیں جو لکڑی کو بیچ میں کھود کر بنایا جائے (لسان) لیکن ترکی میں اور اس سے فارسی میں قاب کے معنی مطلق ظرف یا خانہ کے ہیں اسی لیے عینک کے خانہ کو اور قلم دان کو قاب کہتے ہیں اور پھر اسی سے کھانے کے بڑے برتن کو بھی ہمارے ملک میں قاب کہنے لگے۔

یہی حال رکابی کا بھی ہے، رکاب فارسی میں ہشت پہل پیالہ کو کہتے ہیں اسی سے رکابی بنی اور اب وہ پھیلے ہوئے چوڑے ظرف کو کہتے ہیں اور اسی سے ہندوستانی امرا کے لیے رکاب دار پیدا ہوئے جو کھانے کا انتظام کرتے تھے یا عمدہ عمدہ کھانے تیار کرتے تھے۔

روزمرہ کے کھانوں میں قلیہ قورمہ بہت عام چیزیں ہیں، قلیہ کی شکل عربی ہے، مگر عربی نہیں، قلیہ کی عربی شکل قلیۃ ہو سکتی ہے، عربی میں قلی بھوننے کو کہتے ہیں

اس سے قلیہ بن سکتا ہے اور بھونے ہوئے گوشت کو کہہ سکتے ہیں، ہماری زبان میں قلیہ اس شوربہ دار گوشت کو کہتے ہیں جس میں کوئی ترکاری پڑی ہو بلکہ اسی ترکاری کو قلیہ کہنے لگے ہیں قورمہ تو ترکی معلوم ہوتا ہے۔

شوربا تو صاف عربی کا شربہ ہے مگر معنی بدل گئے ہیں عربی میں شربۂ اس کو کہتے ہیں جتنا ایک دفعہ پی لیا جائے، اس سے ایرانیوں نے شوربا بنا لیا اور گوشت کے پانی کو کہنے لگے، انھوں نے شوربا کو پھر شورباج بنا لیا۔ مگر ہماری ہندوستانی میں شوربا ہی رہا، بگڑا تو شروا[1] ہو گیا۔

اسی عرب شرب (پینا) سے ایرانیوں نے شراب اور شربت تیار کیا۔ اور ہم ہندوستانیوں نے قبول کر لیا، شراب کے عربی معنی ہیں جو چیز پی جائے یہاں تک کہ قرآن میں دودھ کو بھی شراب کہا ہے۔ ایرانیوں نے جس کو شراب کہا اس سے متوالی شراب مراد لی اسی سے یورپی زبان میں سیرپ SYRUP تیار ہوا جو شکر پڑ کر میٹھا ہو گیا۔

لیکن ایرانیوں کے اثر سے ہم نے پانی میں شکر گھول کر جو چیز تیار کی اس کو شربت کا نام دیا لفظ عربی ہے اور معنی عجمی، عربی میں اس کے معنی فقط پینے کے ہیں۔

میٹھے کے بعد نمکین چیز یاد آئی کباب، صورت عربی ہے معنی عربی نہیں کبّ عربی میں اوندھے کرنے کو کہتے ہیں، اب جس گوشت کو اوندھا کر کے آگ پر رکھیے اس کو کباب کہیے۔

کھانے کے بعد تکلفات کی دوسری قسم فرش فروش ہیں۔

قالین سے بڑھ کر خوشنما، خوبصورت اور مضبوط فرش شاید ہی کوئی دوسرا ہو جو زمین کے فرش پر نہیں بیٹھتے وہ بھی کرسیوں کے نیچے اس کو بچھاتے اور اس سے لطف اٹھاتے ہیں، مگر یہ کوئی نہیں بتاتا کہ یہ آیا کہاں سے، ہندوستان میں اس کو

---

[1] ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے معارف کے ایک مضمون میں بڑی تحقیق سے یہ ثابت کیا ہے کہ یہ عربی نہیں فارسی لفظ ہے۔ شور اور با سے مرکب ہے۔ شور نمکین اور با فارسی میں کھانے کو کہتے ہیں۔ شوربا نمکین کھانا۔ با کھانے کے معنی میں سکبا، باورچی اور نانبائی کے لفظوں میں ہے۔

مسلمان لائے، مگر مسلمانوں کو یہ ملا کہاں ہے؟ تاریخ کا یہ بھید خود اسی لفظ کے اندر چھپا ہے۔

ایشیائے کوچک میں آرمینیہ کے علاقے میں ایک شہر کا نام قالیقلا ہے۔ چوتھی صدی ہجری میں یہ اسلامی حکومت کا آخری شہر تھا، اس طرف جب نسبت کی جاتی ہے تو قالی کہتے تھے۔ عربی زبان کا ایک مشہور ادیب اور لغوی اسی نسبت سے ابو علی قالی کہلاتا ہے، یہ فرش قالین اسی شہر کی صنعت اور کاری گری ہے۔ اسی لیئے اس "فرش قالی" پہلے نسبت کے ساتھ کہا گیا، پھر استعمال کی کثرت سے اس کا نام ہی قالی پڑ گیا۔ یاقوت رومی متوفی سنہ ۶۲۶ھ اپنے جغرافیہ معجم البلدان میں قالیقلا کے نیچے لکھتا ہے:

وتعمل بقالیقلا ہذہ البسط المسماة بالقالی، اختصروا فی النسبۃ الی بعض اسمہ لثقلہ۔ (ج۷، ص ۱۷ مصر)	یہ فرش جس کا نام قالین ہے قالیقلا میں بنایا جاتا ہے۔ لفظ میں ہلکا پن کے لیے نسبت میں اختصار مدنظر رکھا ہے (یعنی قالیقلائی کی جگہ صرف قالی کہا ہے)

مؤید الفضلا میں جو فارسی کا قدیم لغت ہے اس کو "قالی" لکھا ہے اور ایک شعر نقل کیا ہے۔ فارسی شعرا نے بھی قالی ہی باندھا ہے اور جس چیز کو ہم غالیچہ کہتے ہیں، عجب نہیں کہ وہ قالیچہ ہو یعنی چھوٹا قالی۔ اب آخر کا نون جو قالین میں ہے وہ "ین" ہے وہ نسبت کے معنی بخشتا ہے جیسے رنگ سے رنگین۔ قالین کے معنی وہ فرش جو قالی کی طرح ہو۔ ایک ی چونکہ پہلے سے موجود تھی، اس لیے دوسری ی نہیں لگی۔ یہ تحقیق میری ایجاد ہے۔ معلوم نہیں صحیح ہے یا غلط۔

تکلفات کی تیسری قسم مکانات ہیں، پہلے بڑے محلوں اور ایوانوں میں اور اب بڑی بڑی کوٹھیوں میں اس حصہ کو جو نوکروں کے لیے بنایا جاتا ہے، ہماری زبان میں شاگرد پیشہ کہتے ہیں۔ بیچارے مولوی نور الحسن صاحب نیر مرحوم (نور اللغات کے مصنف) نے ایک دفعہ مجھ سے استفسار فرمایا کہ اس کو شاگرد پیشہ کیوں کہتے ہیں۔ میں نے ظرافت سے کہا کہ مغل درباروں میں جب بادشاہ پیری مریدی کرنے لگے تو نوکر چاکر چیلہ کہلانے لگے، جس کی شہادت تاریخوں کے علاوہ دلی کا "کوچہ چیلاں" دے رہا ہے، اسی چیلے کی فارسی شاگرد بنائی گئی، اور شاگرد پیشہ اس گروہِ خدام کا نام پڑا اور اس سے ان کے رہنے کے حصے کو بھی شاگرد پیشہ کہنے لگے۔

کچھ دنوں کے بعد میں اپنی بڑی بچی شمیمہ بانو سلمہا کو گلستاں پڑھا رہا تھا، اس میں وہ حکایت آئی جس میں پردہ اور علم کا مناظرہ ہے:

ایں حکایت شنو کہ در بغداد   رایت و پردہ را خلاف افتاد

علم شاہی نے جھک کر پردہ شاہی سے شکایت کی، کہ سفر میں اور لڑائیوں میں تو مارا مارا میں پھرتا ہوں اور قرب سلطانی تم کو حاصل ہے، تم نازنین کنیزوں کے ہاتھوں میں رہتے ہو، اور

من فتادہ بدست شاگرداں

اس سے خیال آیا کہ شاہی ملازمین اور خدم وحشم کے معنوں میں یہ پرانا لفظ ہے اور اسی سے شاگرد پیشہ ہے اور ہماری زبان میں محلوں کے اس حصے کو کہنے لگے، جو خاص طور سے ان کے لیے بنائے جاتے ہیں[1]۔

ایک ہندوستانی لفظ کی اصلیت پر مجھے بڑا تعجب آیا، ایک بار میں عربی کا مشہور لغت تاج العروس دیکھ رہا تھا کہ لفظ راز پر نظر پڑی اس کے معنی اس میں استاد اور ماہر کے لکھے تھے، دفعتہ میرا دھیان اپنے ہندی راج اور راجگیر (معمار) کی طرف گیا، لیکن یقین نہیں آتا تھا کہ عربی کا ایسا لفظ جو عربی میں کتابوں میں اور تحریروں میں برتا نہ گیا ہو وہ ہماری ہندوستانی میں کیسے آگیا ہوگا، لیکن دل یہی کہتا تھا، کتابیں الٹیں پلٹیں، دیکھیں مگر سراغ نہ لگا، اس سال کی گرمیوں کی تعطیل میں برادر عزیز پروفیسر نجیب اشرف ندوی سے پٹنہ میں نصاب الصبیان کی طرح کا ایک قلمی رسالہ فارسی عربی ہندی کا ملا جس میں فارسی اور عربی الفاظ کے مقابل ہندی الفاظ جمع کیے گیے ہیں اور شاید کسی ایرانی یا پارسی کی تصنیف ہو، مصنف کا نام اور زمانہ نہیں دیا ہے، رسالہ کا نام "لسان فارسیات" لکھا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہندوستان کے کسی نووارد ایرانی کے لیے لکھا گیا ہو، تصنیف کا مقام گجرات ہے، اس میں پیشہ وروں کا

---

[1] مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی کا ارشاد ہے کہ اس شاگرد کی اصل "شاہ گرد" ہے، بادشاہ کے اردگرد جو لوگ رہتے تھے ان کو شاہ گرد کہتے تھے اور کثرت استعمال سے وہ شاگرد ہو گیا۔

کا باب دیکھ رہا تھا کہ لفظ راجگیر پر نظر پڑی جس کے معنی اس نے کریا یعنی کرنے والے کے لکھے تھے، دل نے کہا مدت کا کانٹا آج نکل گیا اور معلوم ہوا کہ صحیح لفظ راجگیر ہے، پھر بھی پوری تشفی نہیں ہوئی، خدا بخش خاں کے کتبخانہ میں چلا گیا، فارسی لغت کی کئی کتابیں نکلوا کر دیکھیں مطلب کا پتہ نہ پایا، آخر فرہنگ رشیدی عبدالرشید ٹھٹوی میں یہ عبارت نکلی:

"راز معمار و سرداران گل کاراں بہ ہندی راج گویند لیکن بدیں معنی عربی است عجدی گویند۔"

بہ یکے تیر ہمہ فاش کند سر حصار
در بر کردہ بود تیر گل کار راز

اس عبارت نے پوری تشفی کر دی. واپس آکر برہان قاطع میں دیکھا تو یہ لکھا پایا:

و گل کار را گویند و بعربی طیان خوانند و بعضے گفتہ اند راز در عربی کلانتر و بزرگ بنایان باشد۔

یعنی جس معنی میں ہم مستری کا لفظ بولتے ہیں۔

اچھا تو پھر مستری کیا لفظ ہے؟ خیال جاتا ہے کہ یہ اصل مسطری ہے. مسطر اس آلہ کو کہتے ہیں جس سے سطر سیدھی کی جاتی ہے، پرانے زمانے میں ایک موٹے کاغذ پر موٹے تاگے کو سیدھ سے ناپ کر آج کل کے رولدار کاغذ کی طرح سی دیتے تھے اور اس پر لکھنے کے کاغذ کو دبا کر سطروں کو ابھارتے تھے، تاکہ لکھنے میں سطریں سیدھی ہوں، یہ تو کاغذ کی بات چیت ہوئی، عمارتوں میں دیواروں کی سیدھ قائم کرنے کے جس آلہ سے کام لیا جاتا تھا وہ بھی مسطر ہوا اور اس مسطر سے جو ماہر فن دیکھ بھال اور ناپ کر عمارت کی دیواروں کی سیدھ درست کرتا تھا، وہ مسطری کہلایا اور پھر جب وہ ہندوستانی زبانوں سے ادا ہوا تو مسٹری[1] کا مستری ہو گیا اور اب ہماری زبانوں کا لفظ ہے اور ماہر کاری گر کے معنی میں بولا جاتا ہے۔

بڑھیوں کی بول چال میں ایک لفظ خراد اور خرادنا ہے، میز، کرسی یا پلنگ وغیرہ

---

[1] ڈاکٹر عبدالستار صدیقی صاحب مستری کو پرتگالی فرماتے ہیں اور اس کی اصل بتاتے ہیں، مگر پرتگالی میں خود بہت سے عربی لفظ ہیں۔ "س"

کے پایوں کو چھیل کر کہیں موٹا کہیں پتلا کہیں گاؤدم وغیرہ شکلیں بناتے ہیں یہ خالص عربی لفظ خرط ہے، عربی میں اس کے معنی لکڑی کے اس طرح چھیلنے کے ہیں کہ اس کی اوپری پرت اتر جائے اس سے خراط بنا یعنی وہ آلہ جس سے لکڑی کو اس طرح چھیلا جائے، وہ خراط ہمارے یہاں خراد ہوا[1] اور اس سے خراد پر چڑھانا محاورہ اور خرادنا مصدر بنا۔

یہ لفظ اس حقیقت کا پتہ دیتا ہے کہ لکڑی کی یہ صنعت کاری مسلمانوں کے ذریعہ ہندوستان میں آئی اور پھیلی۔

معماروں کے ایک ضروری آلہ کا نام ہماری زبان میں ساحول ہے، لمبے تاگے میں ایک وزنی لوہا یا اور کوئی دھات گول سی بندھی ہوتی ہے۔ اس کو نیچے لٹکا کر اونچائی سے دیوار کی سیدھ دیکھتے ہیں۔ خوارزمی نے مفاتیح العلوم میں ایک آلہ کا نام شاقول لکھا ہے اور اس کی یہ تشریح کی ہے۔ ہو ثقل یشد بہ فی طرف حبل یمدہ سفلا یحتاج الیہ النجارون والبناؤن (لیڈن ص ۲۵۵) یعنی وہ ایک بوجھل چیز جو رسی کے کنارے باندھ کر نیچے لٹکائیں اس کی ضرورت بڑھئیوں اور معماروں کو ہوتی ہے، اس تشریح سے یہ تو معلوم ہو گیا کہ ہندی ساہول کی عربی صورت شاقول ہے، عربی میں ثقل کے معنی وزن کے لکھے ہیں مگر کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ شاقول ش سے نہیں بلکہ ثاقول ث سے ہو یعنی ثقل اور بوجھ کے معنی مگر ہیئت کی کتابوں میں بھی شاقول ہی دیکھا گیا ہے کیا وہاں بھی تصحیف ہوئی ہے۔

اس کتاب میں بڑھئیوں کے ایک اوزار کا نام الکونیا بتایا گیا ہے اور اس کی تشریح یہ کی گئی ہے۔ یقدرون بہا الزاویۃ القائمۃ (ص ۲۵۵) یعنی اس سے زاویہ قائمہ نکالتے ہیں، کوئی کچھ کہے، ہو نہ ہو یہ لفظ ہمارا کونیا ہے جس کو آج بھی ہمارے کاریگر بولتے اور برتتے ہیں اور اس کا تلفظ کنیا ہے یعنی وہ آلہ جس سے کونہ (زاویہ) ناپیں، یہ ہاتھ ڈیڑھ ہاتھ کی دو لکڑیاں ہوتی ہیں جن کو خط مستقیم جوڑ کر

---

[1] پروفیسر غلام مصطفیٰ خاں لکھتے ہیں کہ شاید ظہوری نے نثر سوم میں سب سے پہلے خراط کی جگہ خراد استعمال کیا ہے وہ کہتا ہے:

فرد از استقامتش خراد زندہ کردہ است کج روی زنہار (معارف مارچ سنہ ۱۹۶۱ء ص ۲۰۰)

کونہ (زاویہ قائمہ) نکالتے ہیں اور اس کی یہ صورت ہوتی ہے۔

یہ کتاب چوتھی صدی ہجری میں لکھی گئی ہے یہ لفظ اتنے پرانے زمانے میں ہندوستان سے غزنویوں کے زمانہ میں وسط ایشیا تک کیسے چلا گیا۔

اس کے بالمقابل ایک دوسرا لفظ ہے جو وسط ایشیا سے ہندوستان آیا ہے یہ جہاز کا لفظ ہے، جہاز دیکھنے میں تو عربی ہے مگر جس معنی میں یہ ہماری زبان میں بولا جاتا ہے وہ قطعاً ہندوستانی یا ہندوستانی فارسی ہے اصل میں اس کے لفظی معنی تو سامان کرنے کے ہیں، اس سے تجہیز بنا، جس کے جہازیوں میں یہ معنی پیدا ہوئے کہ کشتی میں سامان رکھ کر کہیں بھیجنا یہ اصطلاح تیسری صدی ہجری میں پھیل چکی تھی، بزرگ بن شہریار کے سفرنامہ میں ہے:

انہ جہز مرکب لہ الی الزانج (ص ۸) اس نے اپنا ایک جہاز سامان لاد کر جاوہ بھیجا یہ تو دریائی اصطلاح ہوئی، لیکن اس کے سو برس بعد یہ لفظ وسط ایشیا میں خشکی کے سامان تجارت کے معنوں میں سننے میں آتا ہے، حدود العالم میں جو ۳۷۲ھ کی تصنیف ہے یہ لفظ ان معنوں میں بار بار آیا ہے، شروع شروع میں تو مجھے تعجب ہوا کہ یہ جہاز خشکی میں کیسے چلا بعد میں سمجھ میں آیا کہ ابھی یہ لفظ سامان کرنے کے معنی سے قطع مسافت کر کے سامان کی منزل میں پہنچا ہے۔

وجہاز ہائے ہندوستان بدیں شہر افتد ...... و آنجا بردہ
ہند وجہاز ہندوستان افتد (ص ۴۴ ایران)

اس سے یہ بات سمجھ میں آ گئی کہ یہی جہاز بعد کو خشکی سے تری میں آ گیا اور سامان تجارت کے بجائے سامان تجارت لے جانے والے جہازوں کو خود جہاز کہنے لگے ہندوستان میں اکبر کے زمانے میں فرشتہ نے اس لفظ کو اس معنی میں استعمال کیا ہے۔

و بگفتہ فرنگیاں جہازات متردد ساختند (ج ۲ ص ۲، ۳ نولکشور)

اب ہماری زبان میں یہ لفظ مطلق جہاز کے معنی میں بولا جانے لگا اور سامان تجارت اس سے رخصت ہو گیا۔

اس سے ہماری زبان میں خوشی اور غم کے دو لفظ نکلے ہیں ایک جہیز اور دوسرا

تجہیز، جہیز اس سامان کو کہتے ہیں جو شادی میں باپ کی طرف سے لڑکی کو ملتا ہے۔ اس معنی میں یہ لفظ بھی خالص ہندوستانی ہے، اس کی اصل جہاز ہے، سامان دینا یا سامان کرنا، عربی اور فارسی کے قاعدے سے الف میں امالہ ہو کر جہاز سے جہیز ہو گیا اور اب جہیز پر کسی عرب یا ایرانی کا قبضہ نہیں رہا۔

جہاز مردہ کے کفن دفن کے سامان کو بھی عربی میں کہتے ہیں جس سے مصدر تجہیز بنا یعنی سامان کرنا، اس سے ہماری زبان میں تجہیز و تکفین کا لفظ پیدا ہو گیا۔

ذرا ذرا سی مناسبت سے دیکھئے تو کیسے کیسے لفظ بنتے اور معنی بدلتے ہیں، ذرا سی "ذرا" پر غور کیجئے، کیا یہ عربی کا ذرہ نہیں جس کو آپ ذرۂ بے مقدار کی صورت میں اچھی طرح پہچانتے ہیں مگر استعمال کی کثرت سے مخفف ہو کر ذرا کے بہت ہی تھوڑے معنی ہو گیے۔ اور ایسے ہو گیے کہ اب اس کو ذرہ سے ذرا بھی تعلق نہیں رہا۔

ہماری زبان میں ایک لفظ مضمون کی سرخی یعنی عنوان ہے، دیکھئے تو یہ سیاہی سے سرخی کیسے بن گیا، بات یہ ہے کہ پہلے زمانے میں قلمی کتابوں میں باب اور عنوان کو امتیاز کے لیے سرخی سے لکھا کرتے تھے، اب ہمارے زمانہ میں جب چھاپا ایجاد ہوا تو خود باب کے یا مضمون کے عنوان کو سرخی کہنے لگے، چاہے آپ اس کو سیاہی سے لکھیں، اس کی لفظ کی یہ توجیہ تو پہلے ہی سے ذہن میں آ رہی تھی مگر اتفاق سے ایک پرانی قلمی کتاب سے سند ہاتھ آ گئی تو اپنے ذہنی الہام پر تصدیق کی مہر لگ گئی۔ شیخ محمود چراغ دہلی کے مرید سید محمد حسن اپنے مکتوبات میں ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

"کیفیت دیباچہ کہ بقلم مبارک آں محبوب نبشتہ بودند برائے سرخی نبشتن آں سپیدی نبشتہ عین فرستادہ شدہ است در دیباچہ بنویسند .... ذات لفظ صلوٰۃ سرخی بنویسند"

(کتب خانہ حکیم عبدالعزیز مشرقی جالندھر شہر)

کاغذات کی مسل (م س ل) ایک عام دفتری اصطلاح ہے اس کی اصل عربی لفظ "مثال" ہے سرکاری شاہی کاغذات کی اصل تو دفتر میں رہتی تھی اور اس

کی بعینہ نقل (مثال) لوگوں کے پاس بھیجی جاتی تھی۔ اس سے مثال کے دوسرے معنی فارسی میں شاہی فرمان کے پیدا ہوئے اور اس کی جمع امثلہ اور مثل بنی مثال اور مثل نے مسل کی ہندی شکل اختیار کی۔ مثال اور امثلہ کا استعمال غالباً سلجوقیوں کے زمانہ سے رواج پایا، تاریخوں میں کثرت سے یہ لفظ آتا ہے، مثال کے لیے غزنوی عہد کے مبارک شاہ معروف بہ فخر مدبر کی کتاب آداب الحرب والشجاعہ ص ۱۲ کا ایک ٹکڑا پیش ہے:

"مثال توقیع برسانند کہ ہرچہ تعجیل تر باید"

نستعلیق ایک خاص فارسی خط کا نام ہے یہ اصل میں نسخ اور تعلیق کی ہندی ترکیب ہے، ہندی ترکیب کا خاصہ ہے کہ جب دو لفظ ملا کر ایک بنائے جاتے ہیں تو بیچ کا ایک آدھ حرف لفظ کو ہلکا کرنے کے لیے گرا دیتے ہیں، اس طرح نسخ و تعلیق مل کر نستعلیق بنا، عربی میں نسخ لکھنے اور نقل کرنے کو کہتے ہیں، اسی مناسبت سے اہل عجم نے عربی خط کا نام نسخ رکھا، تعلیق اور تعلیقہ کے نام سے اس نے فارسی شکل اختیار کی اور ان دونوں نے مل کر نستعلیق خط بابر کے زمانے میں بنا۔ یہ وہی خط ہے جس میں آجکل اردو لکھی جاتی ہے، یہ خط دوسرے شکستہ وغیرہ خطوں کے مقابلہ میں بہت بنا کر نہایت تکلف سے ٹھہر ٹھہر کر لکھا جاتا ہے اس سے نستعلیق آدمی اور نستعلیق چال کی شکلیں پیدا ہوئیں، چراغ ہدایت میں ہے:

نستعلیق گوئی حرفہا را ساختند گفتن و عبارت را بتکلف ادا
ساختن اشرف گوید

"ز نستعلیق گویا قوت لب، ریحال خط داغم"

اس سے ہماری زبان میں یہ وسعت پیدا ہوئی، کہ نستعلیق لباس نستعلیق چال اور نستعلیق بول چال کہنے لگے۔

بعض لفظوں کی ظاہری شکل و صورت کیا دھوکا دیتی ہے کتنے ہندوستانی لفظ ایسے گورے چٹے ہوتے ہیں کہ ولایتی معلوم ہوتے ہیں اور بعض سانولے رنگ کے ایرانی بھی دیکھے ہیں، ہماری زبان کا ایک بہت ہی خوبصورت لفظ چلبلا ہے، جو غزل گو شاعروں کے ہاں خوب خوب کام آتا ہے، اس کی شکل تو ہندی ہے، مگر ہے ایرانی۔ برہان قاطع میں ہے:

"چلبلہ بضم اول و بائے ابجد بر وزن سنبلہ شتاب و اضطراب را گویند"

ہم سمجھتے تھے کہ اس کا تعلق ہمارے ہندی لفظ چھل بل سے ہے۔ اب غور کرنا پڑے گا۔

لفظ بھی کیا کیا صورت بدلتے ہیں، موٹے کپڑے کو ہم گنگش کہتے ہیں، مگر یہ آیا کہاں سے۔ فارسی میں اس کی صورت گزہ ہے۔ بفتح اول و سکون ثانی و زائے نقطہ دار، ہر چیز گندہ و قوی و سطبر را گویند (برہان قاطع) اس کی دوسری شکل غفص کی ہے، صورت تو عربی ہے، مگر عربی نہیں۔

احدی کے معنی ہماری زبان میں سست اور کاہل کے ہیں، مگر ان سست کاہلوں کی پیداوار تاریخی ہے۔ احدی اَحَدی ہے، احد کے معنی عربی میں ایک ہیں وہ سپاہی جو فوج سے اکیلا ڈیوڑھی کی خدمت پر مامور رہتا تھا۔ اکبر نے اس کو احدی (اکیلا) کا لقب بخشا۔ یہ احدی کھاتے تھے اور ڈیوڑھے پر پڑے رہتے تھے۔ کوئی کام کاج ان سے متعلق نہ تھا، اس لیے زبان خلق نے اس کو سست و کاہل کے معنوں میں کہہ کر پکارا۔ زبان خلق کو کون روک سکتا ہے۔

ہماری زبان میں ایک لفظ قلعی ہے آیئے اس کی بھی قلعی کھولیں، ہم لکھتے گو قلعی ہیں مگر بولتے قلئی ہیں۔ ہماری زبان میں اس کے معنی سپیدی اور صفائی کے ہیں، برتنوں پر قلعی کی جاتی ہے اور مکانوں پر قلعی پھیری جاتی ہے۔

یہ لفظ گو پرانی عربی کا نہیں، مگر پھر بھی عربی لغتوں میں ملتا ہے قلعیُ عربی میں (لسان) اور اس سے فارسی میں (مؤید الفضلا) رانگے کو کہتے ہیں۔ مگر رانگے کو قلعی کیوں کہتے ہیں؟ لسان العرب کا بیان ہے کہ قلع ایک کان کا نام ہے جس سے رانگے کی بہترین قسم نکلتی تھی اس لیے اس کی طرف نسبت کر کے اچھے رانگے کو قلعی کہتے ہیں اور چونکہ اسی رانگے سے تانبے کے برتنوں میں سپیدی پھیری جاتی ہے۔ اس لیے اس کو قلعی کرنا کہنے لگے، پھر چونے سے بھی اگر مکانوں میں سپیدی پھیری گئی۔ تو اس کو بھی قلعی پھیرنا کہہ دیا۔ ہماری زبان میں ان استعمالوں سے یہ معنی پیدا ہوئے کہ کسی داغ دھبے یا کسی کے عیب کو اگر چھپا یا جائے تو وہ اس پر قلعی کرنا ہوا اور اگر اس داغ دھبے کو ظاہر کر کے سب کو دکھا یا جائے

تو وہ قلعی کھولنا ہوا۔

تماشا بھی عجیب تماشے کا لفظ ہے۔ لفظ تو عربی ہے لیکن معنی عجمی ہیں، یہ مشی سے بنا ہے۔ جس کے معنی چلنے کے ہیں۔ اس کو باب تفاعل میں لے گئے، تو تماشی ہوا اور معنی باہم مل کر چلنا ہوئے، عجمیوں نے تماشی کو اپنے قاعدے سے تماشا بنالیا۔ جیسے تمنّی کو تمنا بنادیا چونکہ سیر و تفریح کے لیے چند احباب ساتھ مل کر چلتے ہیں، اس لیے خود سیر و تفریح کو تماشا کہنے لگے، اس کے بعد آگے بڑھے تو سیر و تفریح کے سامان کا بھی تماشا نام رکھا۔

بجرم عشق تو مارا کشند غوغائیست
تو نیز بر سر بام آ کہ خود تماشائیست

(معارف مئی سنہ ۳۹ء)

تہنید

تہنید کے اگر ہم ٹھیٹ معنی کریں تو "ہندیانا" کہہ سکتے ہیں، یہ اصطلاح اصل میں عربوں سے چلی، وہ جب کسی دوسری زبان کے لفظ کو اپنی زبان کے اصول پر خراد کر اس کو عربی بنا ڈالتے تھے تو وہ اپنے اس عمل کو تعریب کہتے تھے، یہی قاعدہ فارسیوں نے اپنی زبان میں جاری کیا تو اس کو تفریس کہا یعنی فارسی بنالیا۔ اب جب اہل ہند یہی کہیں یعنی وہ کسی دوسری زبان کے لفظ کو اپنی زبان کے اصول پر تراش خراش کر کے اپنی زبان میں ملالیں تو اس کو تہنید کہیں گے۔

یہ اصول زبانوں کے بڑھنے اور پھیلنے کے لیے بہت مفید ہے، یہ اصول قریب قریب دنیا کی سبھی زبانوں میں چلتا ہے اور اس کے مانے بغیر ممکن ہی نہیں کہ زبان ترقی کر سکے۔

بات یہ ہے کہ زبان جامد چیز نہیں، وہ ہمیشہ بڑھتی پھیلتی اور ادلتی بدلتی رہتی ہے، جو زبان بڑھنا چاہے گی، اس کو دنیا کی دوسری زبانوں سے سروکار رکھنا پڑے گا اور قوموں کے میل جول کے ساتھ ان کی بولیوں اور لفظوں کی آمد و رفت بھی لگی رہے گی۔ اس کا ثمرہ یہ ہوگا کہ اس میں دوسری زبانوں کے لفظ ملتے رہیں گے اور بدلتے رہیں گے۔

ہر زبان کے لفظوں میں حرفوں کی خاص ترتیب اور اس ترتیب سے خاص شکل پیدا ہوتی ہے، جس طرح انسان انسان سب برابر ہیں، پھر بھی فرنگی، حبشی، ہندی، چینی، ترکی سب کی شکلیں ایک نہیں ہوتیں، ہر ایک کا رنگ دروپ اور ناک نقشہ ایک نہیں ہوتا، یہی مختلف بولیوں اور ان کے لفظوں کا حال ہے، اسی لیے ایک قوم کا آدمی جب دوسری قوم کی بولی کا لفظ لیتا ہے، تو اس کی زبان کی فطرت مجبور کرتی ہے کہ ارادہ اور احساس کے بغیر اس کی شکل بدل دے، ہندوستان کے باہر کا آدمی خواہ کچھ ہی کرے مگر وہ ہمارے ہندی حرفوں کو کبھی نہ بول سکے گا، وہ

وہ اس کو کچھ نہ کچھ بدل دے گا اور نہ وہ ہمارے لہجے سے ہمارے لفظوں کو نکالے گا، وہ اس میں بھی کچھ ہیر پھیر کرے گا۔

یہی حال ہندیوں کا بھی ہے، عربی کے خاص حروف وہ ادا نہیں کر سکتے ع، ء اور الف میں اور ث، ص اور س میں اور ت اور ط میں وہ فرق نہیں کر سکتے اس لیے دوسری زبان کا جو لفظ ہمارے یہاں آئے گا وہ جب تک اپنی بیگانگی چھوڑ کر بالکل گھریلو نہ بن جائے گا وہ ہمارے دیس میں رہ نہیں سکتا، یہی وجہ ہے کہ عربی، فارسی، سنسکرت، انگریزی وغیرہ کے جو ہزاروں لفظ ہماری زبان میں آ گئے ہیں وہ ہماری زبان کے قاعدوں پر چڑھ کر ہماری زبان کی شکل وصورت اختیار کرنے پر مجبور ہیں۔

معمار کے معنوں میں راج کی اصل عربی و فارسی راز ہے مگر ہمارا ہندوستانی لفظ راج ہی ہوگا، عربی کا صحیح لفظ تمنّیٰ ہے، مگر فارس والوں نے اس کو لیا تو تمنا کر دیا اور ہم نے بھی اسی کو قبول کیا، عربی تماشی کو ایرانیوں نے تماشا کیا اور ہم کو بھی یہی تماشا پسند آیا۔ لالٹین کی اصل لنٹرن ہے، مگر ہم کو لالٹین ہی کی روشنی پسند ہے۔ بٹن انگریزی ہو تو ہو، مگر ہمارا لفظ تو بوتام ہے جو بٹن کی بگڑی ہوئی شکل ہے لفظ تبادلہ عربی کے لحاظ سے غلط ہی کیوں نہ ہو، لیکن ہماری زبان میں یہ صحیح ہے، اس کو چھوڑ کر مبادلہ یا تبادل بلوانے کی کوشش زبردستی ہے۔

محاذ کی عربی اصل محاذی اور ہندوستانی ورے (دلی میں بولا جاتا ہے) کی اصل عربی میں وراء ہے مگر اب محاذ اور ورے کو چھوڑ کر ان معنوں میں محاذی اور وراء نہیں بولا جائے گا، تبدیل کے مقابلہ میں تبدیلی غلط ہو، مگر وہ ہمارے یہاں صحیح ہے۔ خود صحیح کو سہی ہم نے کر دیا ہے اور اس سے ایک نئے معنی پیدا کر لیے ہیں، احوال عربی میں جمع ہی کیوں نہ ہو، مگر وہ ہماری زبان میں واحد کے طور پر بولا جاتا ہے، معنی کا لفظ عربی میں واحد ہے مگر اردو والے اس کو جمع بولتے ہیں، ماتحت عربی کے لحاظ سے بے معنی ہے مگر ہماری زبان کا وہ نہایت صحیح و فصیح اور بامعنی لفظ ہے، آشا ہندی کا چاہے کچھ لفظ ہو، مگر ہماری زبان میں وہ آس بن کر آیا ہے اور وہی صحیح ہے، ہندی میں وچار کا لفظ ہو، ہو مگر وہ ہمارے ہاں بچار ہے۔

اسی طرح عربی، فارسی، سنسکرت، ہندی اور یورپ کی زبانوں کے ہزاروں لفظ اپنی اپنی صورت بدل کر ہماری زبان میں ایسے رل مل گئے ہیں کہ ان کو پہچان کر اگر ہم ان کی اصل شکلوں میں لکھنے اور بولنے لگیں تو خود ہماری زبان کی حکومت ہمارے ملک سے اٹھ جائے گی اور ایسے بدیسیوں کی بھیڑ دکھائی دے گی، جو ہمارے دیس کے قانون کو نہیں مانتی۔ اسی لیے ان بدیسیوں کو اس دیس میں رہنے سہنے کی اجازت اسی وقت مل سکتی ہے جب وہ ہمارے دیسی قانون کو قبول کر کے دیسی بن جائیں۔

لفظی شکل و صورت کے تغیر سے بڑھ کر معنوی تغیرات ہیں، ہزاروں عربی و فارسی کے ایسے لفظ ہیں، جن کے معنی خالص ہندوستانی ہیں جن کو عربی اور فارسی والے جانتے بھی نہیں اور وہ اسی قاعدے کے مطابق بنے ہیں۔

اسی سے کسی زبان کی خود مختارانہ حکومت کا پتہ چلتا ہے، لفظ خواہ کسی قوم اور ملک کے ہوں، مگر جب وہ دوسری قوم اور ملک کی زبان میں چلے جاتے ہیں تو ان کی مثال ان لوگوں کی سی ہے، جو پیدا کہیں ہوئے ہوں لیکن جب کسی دوسرے ملک کی رعایا بن جاتے ہیں تو اسی دوسرے ملک کے قاعدے اور قانون ان پر چلا کرتے ہیں، اس وقت یہ نہیں دیکھا جاتا کہ ان کی پیدائش کہاں کی ہے اور یہ پہلے کس کی رعایا تھے۔

کسی لفظ کو ہندوستانی بنانے کے بعد ہم کو حق ہے کہ ہم اس کے وہ معنی سمجھیں جو اصل معنی سے مجاز کے طور پر یا اس کے قریب ہونے یا کسی اور لگاؤ کی وجہ سے ہماری زبان میں پیدا ہو گئے ہیں۔

اسی فقرہ میں دیکھیے کہ وجہ عربی لفظ ہے، عربی میں اس کے معنی مُنہ کے ہیں اس سے رخ کے معنی پیدا ہوئے، اور اس سے سبب کے معنی پیدا ہو گئے، خود سبب کیا ہے، عربی میں اس کے معنی رسی اور ڈوری کے ہیں جس سے کسی کو باندھا جائے، اس سے عربی میں ذریعہ کے معنی پیدا ہو گیے، اس سے اہل فقر اور فارسی اور اردو والوں نے اس کو علت اور وجہ کے معنی میں بول دیا اور لیجیے اس کی جمع اسباب بنائی اور اس کے دو معنی قرار دیے، جب اس کو مفرد کے طور پر بولیں تو سامان سمجھیں اور جب جمع بولیں تو وہ سبب کی جمع ہے۔

اسباب کے معنی سامان کے نہ عربی میں، نہ فارسی میں، خالص ہندوستانی

میں رہیں۔

میں نے معارف میں ایک دفعہ اثر کی جمع اثرات لکھ دی تھی، میرے مخدوم دوست سید مقبول احمد صاحب صمدنی نے جو بڑے نستعلیق انشا پرداز و نفاست پسند اہل قلم ہیں، خط لکھ کر مجھے ٹوکا کہ "عربی میں اثر کی جگہ آثار ہے اثرات نہیں"۔ میں نے مذاقاً جواب دیا کہ میں نے وہ لفظ اردو میں لکھا ہے، عربی میں نہیں۔

لیکن یہ مذاق ٹالنے کی بات نہیں خدا جانے اور کتنے فضلا اس قسم کی بالارادہ غلطیوں کو لکھنے والوں کی جہالت سمجھتے ہوں گے، مگر بات یہ نہیں، عربی میں اثر کے معنی زمین پر قدم کے نشان کے ہیں، قرآن میں انھیں معنوں میں یہ لفظ آیا ہے، اہل فلسفہ کو اپنے لیے لفظوں کی ضرورت پڑی، انھوں نے اس کو لیا، اور اس سے تاثیر اور تاثر اور اثر بمعنی نتیجہ کئی لفظ بنا لیے اس سے فارسی اور اردو میں اثر نتیجہ کے معنی میں آگیا، یعنی جس طرح قدم اٹھ جانے کے بعد قدم کا نشان رہ جاتا ہے، اسی طرح کسی شے کے ہٹ جانے یا مٹ جانے کے بعد جو نشان رہ جائے اس کو اس کا اثر کہنے لگے، اب اس کے بعد اثر خاصیت کے معنی دینے لگا، جیسے فلاں دوا کا اثر یہ ہے، میری بات کا اثر یہ ہے، ملک میں ان کا اثر ہے۔

اب جمع میں آئیے، اس کی عربی جمع آثار بنی لیکن اردو میں اس کے معنی قرینہ کے ہوں گے، جیسے آثار سے یہ معلوم ہوتا ہے، یا پھر دیوار کا آثار ہے، یا پرانی یادگاروں کے معنی میں ہے، جیسے آثار قدیمہ اسی لیے اثر نتیجہ یا تاثیر کے معنی میں جب بولیں گے تو اس کی جمع اثرات بنائی جائے گی، خواہ وہ عربی کے لحاظ سے کتنی ہی بے قاعدہ ہو

قرینہ ہی کا لفظ دیکھیے، عربی میں قرن کے معنی ملانے کے ہیں، قرین ان دو جانوروں میں سے ہر ایک کو کہتے ہیں، جن کے پاؤں ایک رسی میں ملا کر باندھ دیے جائیں، اس سے قرین کے معنی ہمسر کے اور قرینہ کے معنی بیوی کے ہو گئے، لیکن اردو میں قرین کے معنی قریب، نزدیک اور پاس کے ہیں اور قرینہ کسی شے کے ہونے کے قیاسی لوازم، جیسے قرینہ یہ کہتا ہے، قرینہ سے یہ معلوم ہوتا ہے

اب لوازم کو دیکھیے، عربی لفظ لزم اور لزوم سے نکلا ہے، لازمہ کی جمع ہے کسی شے سے چپک جانے کو لزوم کہتے ہیں، اس سے اہل منطق نے ایسے مفہوم و معنی میں

جس کا کسی دوسری شے سے چپکا رہنا ضروری ہے یا وہ اس سے الگ نہیں ہو سکتا، اس کو استعمال کیا۔ اسی سے ہماری اردو میں لازم کے معنی ضروری کے ہو گئے، اسی کی جمع کسی طرح لوازم بنی اب اردو میں اس کی جمع لوازمات بنائی گئی اور اس کے معنی کسی شے کے ضروری سامان و اسباب کے ہو گیے، لوازمات کے اس معنی کا اردو واحد سینے لوازمہ جس کو عربی سے ادنیٰ تعلق نہیں۔

جنس کا لفظ کون نہیں جانتا، مگر یہ جنس عرب کی نہیں یونان کی ہے، عربی میں منطق والے لائے اور اس کی تعریب کر کے اس سے تجنیس، مجانست، تجانس وغیرہ مصدر بنائے۔ جنس منطق کی اصطلاح میں اس کل (عام چیز) کو کہتے ہیں جس کے تحت میں کئی مختلف حقیقتوں کی اشیاء داخل ہوں، جیسے حیوان کہ یہ انسان اور گھوڑے، گدھے گائے، بھینس، بکری وغیرہ ہر جاندار کو کہتے ہیں۔ اب اس سے ادبی جنس پیدا ہوئی یعنی کسی حقیقت مختلفہ کے مختلف افراد، اس سے ابنائے جنس بنایا (ایک جنس کے بیٹے) یعنی ایک حقیقت کے سارے شریک، جیسے سارے انسان آپس میں ابنائے جنس ہیں اب اس سے بھی خاص ہو کر ہم جنس بنا۔

کند ہم جنس با ہم جنس پرواز
کبوتر با کبوتر باز با باز!

اب اس سے آگے بڑھ کر ہندوستان میں جنس کے معنی قسم ہو گیے، کہتے ہیں "نقد و جنس" نقد کے معنی روپیے پیسے کے اور جنس غلہ یا سامان، اس کی جمع اجناس جو بنی تو یہ غلوں کے اقسام پر مشتمل ہو گئی اور نرخ اجناس کی صورت میں اس کی جنس ہی بدل گئی۔

لفظ نقد کو تو دیکھیے، کہ یہ کیا ہے، نقد کے عربی معنی پرکھنے کے ہیں اس سے ریویو کے معنی میں آجکل نقد یا تنقید بولتے ہیں، چونکہ پرکھے سکّے جاتے ہیں، اس سے فارسی میں نقد کے معنی سکّے کے ہو گیے، اور دام کی صورت میں سکّے دیے جاتے ہیں، اس لیے اردو میں نقد دام کے معنی اس دام کے ہوئے جو فوراً دیے جائیں اور نقد ادھار دو مقابل کے اردو لفظ ہو گئے۔

خیر عربی کا لفظ ہے۔ اس کے معنی بھلے اور نیک کے ہیں، ہماری زبان میں یہ لفظ ایک تکیۂ کلام کی صورت میں ہے اور اکثر ذرا وقفہ کے طور پر یہ بول دیا جاتا ہے:

پھر ہم نے اس میں ی اور ت لگا کر اس کو خیریت بنا دیا اور اس کے معنی اچھی خیر کے ہو گیے رات لگا کر اس کی بے قاعدہ جمع خیرات بنا دی تو صدقہ کے معنی ہو گیے۔

عربی میں مونث لفظوں کی جمع سالم بنانے کا طریقہ یہ ہے کہ ان کے آخر میں ات لگا دیے جائیں، جیسے مسلمہ سے مسلمات، مگر پہلے فارسی والوں نے اور ان کی دیکھا دیکھی ہندوستانیوں نے اس میں ایسی آزادی برتی کہ فارسی اور ہندی لفظوں تک کی جمع اسی طرح بنانے لگے، جیسے کاغذات، دستاویزات دیہات، اس سے زیادہ لطف کی بات یہ ہے کہ جس لفظ کے آخر میں ہ دیکھا، اس میں جات لگا دیا، جیسے صوبہ جات، میوہ جات، علاقہ جات۔

علاقہ ہندوستان میں زمینداری کے گانوں کو کہتے ہیں، عربی میں اس کے معنی لگاؤ کے ہیں، اسی لگاؤ سے ہر چیز جس سے آپ کو لگاؤ ہے آپ کا علاقہ ہے۔ غدر کے معنی عربی میں بے وفائی کرنے کے ہیں: اس سے اس بے وفائی کو کہنے لگے، جو فوج اپنے عہد کو توڑ کر اپنے افسروں سے کرے، اس فوجی بے وفائی کا نتیجہ بدامنی ہے، یہ دونوں معنی ہندوستان میں پیدا ہوئے، اور بڑے شہروں میں بدامنی کے واقعے زیادہ پیش آتے ہیں تو بڑے شہر کو ہم نے غدار شہر کہہ دیا۔

ایک جائداد کی فروخت کا ذکر ہو رہا تھا، اس پر ہمارے گانوں کے ان پڑھ پٹواری نے کہا " دیکھ لیا جائے کہیں جداد مبوس تو نہیں ہے "۔ جداد تو میں سمجھا کہ جائداد ہے، مگر مبوس نہیں سمجھا، مگر سوچتا رہا، کچھ دنوں کے بعد خیال آیا کہ یہ عربی محبوس ہے جس کے معنی قیدی کے ہیں، اسی سے حبس اور محبوس عربی میں وقف کے معنی میں ہے، اب معلوم ہوا کہ وہ پرانے شاہی کاغذات کی اصطلاح بولا، مقصود یہ تھا کہ یہ دیکھ لیا جائے کہ یہ جائداد کہیں قید تو نہیں یعنی کسی کے یہاں رہن یا بیع تو نہیں،

تقریب کے معنی نزدیک کرنا، پھر جو کسی مقصد سے قریب کرنے کا ذریعہ ہو اس کو تقریب کہا، ہندوستانی ملاقات کے ذریعہ کو تقریب کہنے لگے،

تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیے

ملنے ملانے کا سب سے عمدہ موقع کسی شادی اور خوشی کے مراسم کا موقع ہے، اس لیے ہم شادی و خوشی کے موقعوں کو تقریب کہنے لگے۔

جناب کے معنی چوکھٹ کے ہیں، بادشاہوں سے براہ راست مخاطب نہیں ہوا جاتا تھا، اس لیے ان کے آستانہ اور چوکھٹ کی طرف نسبت کرکے بات کہی جاتی تھی، اس سے جناب تعظیمی خطاب کا لفظ ہو گیا۔

حضرت بھی بڑے حضرت ہیں، حضرت کے اصلی معنی حاضر ہونے کے ہیں، اس سے حضرت کے معنی عربی میں بادشاہ کے حضور اور پیشگاہ کے ہوئے ہمارے ہندوستان میں اب یہ بھی تعظیمی لفظ ہو گیا، مگر معلوم ہوتا ہے کہ یہ مغلوں کے زمانے میں بنا اس سے پہلے بندگی اور خدمت کے لفظ تھے، ان دونوں کے ایک ہی معنی ہیں۔

حضرت ہی کی دوسری صورت حضور ہے اس کے بھی وہی معنی اور وہی روداد ہے، حضرت کے ساتھ صاحب کا بھی خیال آیا، صاحب کے عربی معنی ساتھی کے ہیں، اس سے عربی میں والا کے معنی پیدا ہوئے جیسے صاحب علم (علم والا) اس کے بعد وزیروں کو جو بادشاہوں کے ساتھی اور مصاحب ہوتے تھے، صاحب کہنے لگے، جیسے صاحب ابن عباد وغیرہ۔ اب صاحب کے معنی آقا کے ہوئے اور ہر نام کے آخر میں تعظیم کے لیے لگنے لگا، انگریز آئے تو وہ سارے ہندوستانیوں کے آقا ٹھہرے، اس لیے وہ صاحب ہوئے۔

ایک بادشاہ کی جگہ پر جب دوسرا بادشاہ تخت پر بیٹھتا تھا، تو اس کے لیے عربی کا لفظ جلوس غیر عربوں نے استعمال کیا، جس کے معنی بیٹھنے کے ہیں اور سال جلوس تخت نشینی کے سال کی اصطلاح بنی اور چونکہ جب نیا بادشاہ پہلی دفعہ تخت پر بیٹھتا تھا، تو تزک و احتشام اور لاؤ لشکر کے ساتھ نکلتا تھا، تو ہم ہندوستانی تزک و احتشام کے ساتھ کسی مجمع کے نکلنے کو جلوس کہنے لگے، اس کو عربی سے کوئی تعلق نہیں، اور جب بادشاہ اور حاکم دربار میں بیٹھے، تو ہم نے جلوس سے اجلاس بنا لیا، جس کے معنی بٹھانے کے ہیں اور اب نئے زمانے میں انجمنوں اور جلسوں کے بھی اجلاس ہونے لگے۔

جس جگہ بیٹھیں عربی میں اس کو مجلس کہتے ہیں، بعض علماء اور صوفیا نے یہ طریقہ اختیار کیا تھا۔ کہ خاص دنوں میں بیٹھ کر لوگوں کو وعظ و نصیحت کیا کرتے تھے درس دیتے، اس سے اس قسم کی نشست اور پھر اس نشست کی تقریروں کو مجلس کہنے لگے، ہندوستان میں ایسی نشستوں کو کہتے ہیں جن میں لوگ مذہبی اور علمی تقریریں کریں، یا مرثیے پڑھیں، اور اس سے ہم نے علم مجلس بنایا جن میں تہذیب و شائستگی کے ساتھ مجلسوں میں اٹھنے بیٹھنے اور سلیقہ اور دلچسپی کی باتیں کرنے کے ڈھنگ سکھائے گئے۔

جلوس سے قعود یاد آیا، قعود کے معنی بھی عربی میں بیٹھنے کے ہیں، اس سے عربی میں لفظ قاعدہ بنا اور اس کے معنی بنیاد کے ہوئے، یعنی دیوار کا وہ حصہ جو زمین کے اندر بیٹھے، چونکہ بنیاد ہی کے اوپر ساری عمارت کھڑی ہوتی ہے، اس لیے اہل علم نے اپنی اصطلاح میں ان اصول کو جن پر بہت سے مسئلوں کی بنیاد ہو قاعدہ کہا اور اب ہماری زبان میں قاعدہ قانون کے معنی دینے لگا، اس کی جمع قواعد بنائی اور اس کو جمع مذکر کے طور پر استعمال کیا تو اس کے معنی جزئی قانون کے ہوئے لیکن ہم نے فوج کے نظم و ضبط اور ترتیب کے ساتھ چلنے، آگے بڑھنے، پیچھے ہٹنے کے قاعدے بنائے تو ان کا نام بھی قواعد رکھا اور وہ ان معنوں میں واحد مونث ہے اور خالص ہندوستانی ہے۔

قاعدے کے ساتھ اصول پر نظر رہے، یہ عربی میں اصل کی جمع ہے، اصل کے معنی عربی میں جڑ کے ہیں، اس لیے جب ایک بات کی جڑ پر مسئلوں کے بہت سے تنے کھڑے ہوں، اس بات کو اصل کہنے لگے، اور اس کی جمع اصول بنائی، مگر جب ہم ہندوستانیوں نے اس کا استعمال کیا تو واحد کی صورت میں تو اصل کے معنی حقیقی اور واقعی کے کر دیے اور جمع کی صورت میں اصول کے معنی قاعدوں کے کر دیے اور اس جمع کو واحد بنا لیا اور کہنے لگے ایک اصول یہ ہے اور جب اس کی جمع کی ضرورت ہوئی تو اردو کے قاعدے سے اصولوں کر دیا اور کہا کہ ان اصولوں سے ہم کو انکار نہیں

مادہ مد سے اسم فاعل مؤنث ہے، اس کے معنی پھیلنے پھیلانے کے ہیں اور مادے کے معنی پھیلنے والے کے لیے، یونانی زبان سے فلسفہ کا ترجمہ جب عربی میں ہوا

تو جسم کی صورت میں جو چیز پھیلی ہوئی ہے اس کا نام مادہ گھڑ کر رکھا اور اس کی جمع مواد بنائی، ہماری زبان میں یہ لفظ مواد واحد کی صورت میں زخم کے اندر جو چیز بھری ہوتی ہے اس کے لیے بولا جانے لگا، انگریزی میں مادہ کو میٹر کہتے ہیں اور کسی مضمون کے معلومات کو بھی میٹر کہتے ہیں، اس لیے ہماری زبان میں میٹر کا ترجمہ بھی مواد ہے اور بولا جانے لگا۔

حکیم برہم مرحوم (مشرق گورکھپور کے ایڈیٹر) نے مجھ سے کہا تھا کہ اصل اور مواد ان دونوں لفظوں کو سب سے پہلے مولانا شبلی مرحوم نے اردو میں ان نئے معنوں میں استعمال کیا۔

دولت عربی لفظ ہے، معنی ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں جانا عربی میں جب مختلف سلطنتیں یکے بعد دیگرے بنیں، اور مٹیں، تو سلطنت کو دولت کا نام دیا گیا اور جمع دول بنائی گئی۔ ان معنوں میں آج بھی دولت برطانیہ اور دول یورپ ہم بولتے ہیں، سلطنت اور بادشاہی خوش قسمتی سے ہاتھ آتی ہے اس لیے ایرانی دولت کو خوش قسمتی کے معنوں میں بولنے لگے۔ جس کی یادگار فارسی کے بدولت ہماری ہندوستانی میں بھی لفظ بدولت بولا جاتا ہے، جیسے کہتے ہیں آپ کے بدولت یہ ملا۔ اور پھر بدولت ذریعہ کے معنی میں ہو گیا، خوش قسمتی کی بڑی نشانی زر و مال ہے، اس لیے یا اس لیے کہ یہ زر و مال بھی ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں جاتا ہے اس کو بھی دولت کہنے لگے اور اس سے دولت دولت مند اور دولت مندی کے لفظ ہندوستانی کو ہاتھ آئے۔

عربی میں غصہ کے معنی حلق میں کسی چیز کے اچھو ہو جانے یا اٹک جانے کے ہیں۔ ہندوستانی میں اس کے معنی غیظ و غضب کے ہو گیے، خفا فارسی میں خفہ ہے اور معنی وہی گلے میں اٹکنے اور پھنسنے کے ہیں، ہندوستانی میں خفا ہونا، ناراض ہونے کے معنی میں ہے۔

بعض لفظ خیالات کے بدولت ہاتھ آئے ہیں، عربی میں فلک آسمان کو کہتے ہیں، چونکہ نجوم اور جوتش نے ہم کو یقین دلایا ہے کہ ہماری ساری مصیبتیں آسمان کی گردش کا نتیجہ ہیں، اس سے ہم نے فلک سے فلاکت بنایا، اور اس سے فارسی

کی ترکیب دے کر فلاکت زدہ (فلاکت کا مارا) کیا اور پھر اس کو عربی لفظ سمجھ کر اس کا مفعول مفلوک بنا لیا، اور عربی اضافت دے کر مفلوک الحال کہہ دیا، حالانکہ اس کے ان معنوں کو عرب جانتا بھی نہیں۔

ہر لفظ پر اس تفصیل سے لکھنا پوری تصنیف کے برابر ہے، اس لیے ہم ذیل میں کچھ اور ایسے عربی لفظ لکھ دیتے ہیں، جن کے معنی ٹھیٹ ہندی ہیں، یا فارسی کے اثر یا اہل فلسفہ کی اصطلاحوں سے ایسے معنوں میں بولے جاتے ہیں۔ جو عربی قطعاً نہیں۔

عربی	عربی معنی	اردو معنی
قطعاً	کاٹ کر (یعنی ہر شک کو کاٹ کر)	یقینی طور سے
لفافہ	لپیٹ	خول، لفافہ
غارت	لوٹ	بربادی
اعتراض	آگے جانا، سامنے پھیل جانا	اعتراض کرنا
عرض	پھیلانا	پیش کرنا
مقدمہ	آگے کیا ہوا	جو جھگڑا عدالت میں پیش ہو
متانت	بھاری ہونا	مہذب ہونا
متین	بھاری	مہذب
میزان	تول، ترازو	جمع
مذاق	چکھنا	ظرافت
اہتمام	غم کھانا	اہتمام کرنا
مہتمم (صحیح مہتم)	غم کھانے والا	مہتمم
انتظام	دھاگے پرایا جانا	انتظام کرنا
منتظم	دھاگے میں پرونے والا	انتظام کرنے والا
غلام	لڑکا	غلام، بندہ
فرض	واجب کرنا	ذمہ داری
ولی	دوست، متولی	سرپرست، خدا رسیدہ، خدا کا دوست

عربی	عربی معنی	اردو معنی
محاذ	مقابل	لڑائی کا میدان
فوج	گروہ، جھنڈ	لڑائی کا لشکر
محنت	رنج و تکلیف	محنت یعنی پوری کوشش
شکل	مثل، مشابہ	صورت
شکیل	ہم مثل	خوبصورت
نقل	کسی چیز کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانا ایک جگہ کی خبر کو دوسری جگہ بیان کرنا	
منظور	دیکھا گیا	قبول
دماغ	دماغ	دماغ، غرور
مدمغ	×	مغرور
غرور	دھوکا	غرور
مغرور	دھوکا کیا ہوا	مغرور
انکسار	ٹوٹنا	خاکساری
استقلال	کم سمجھنا	مضبوطی، ثابت قدمی
عمارت	آبادی	بڑا مکان
تعمیر	آباد کرنا	بڑی عمارت بنانا
کسر	توڑنا	(اردو کسَر) عیب کمی
اجلاس	بٹھانا	عدالت یا انجمن کی نشست
ضبط	نگاہ رکھنا	ضبط کر لینا، حاکم کا چھین لینا
ضابطہ	نگاہ رکھنے والا	قاعدہ
تقریر	ثابت کرنا	تقریر کرنے والا
اقبال	سامنے آنا	خوش قسمتی
ادبار	پیچھے ہونا	تنزل
اقبال	(بے معنی)	اقبال کرنا. قبول کرنا
رقم	لکھنا	تعداد، چیزوں کی قسم

عربی	عربی معنی	اردو معنی
خراب	ویران	برا، سست
دقت	باریکی	مشکل
غلیظ	موٹا	نجس
امیر	حاکم	دولت مند
غریب	مسافر	مفلس
تربت	مٹی	قبر
نفسانیت	جان ہونا	خود غرضی
غرض	نشانہ	مقصد
غایت	گھوڑدوڑ کی اخیر حد	غرض، آخری حد
عرصہ	میدان	مدت
مدت	درازی	زمانہ
محصول	جس کا حصول ہو	ٹیکس
موضع	رکھنے کی جگہ	گانوں
مکان	ہونے کی جگہ	گھر
بخار	بھاپ	بخار، (تپ)
احاطہ	گھیرنا	گھیرا
خاطر	دل میں کھٹکنے والا	مہمان کی عزت کرنا
منت	احسان	عاجزانہ خوشامد
حلوا	میٹھا	حلوا
دہشت	تعجب و حیرانی	خوف
شہوت	کسی قسم کی خواہش	جنسی خواہش
اشتہا		کھانے کی خواہش
مبلغ	کسی حد تک پہنچا ہوا	روپیوں کی تعداد
ماتم	میت پر غم کرنے کیلیے جمع ہونے کی جگہ	میت کا غم
حقہ	ڈبیا	حقہ

اس قسم کے ہزاروں عربی لفظ ہیں، جو اپنے خاص معنوں میں ہماری زبان کے خاص لفظ ہو گئے ہیں۔ یہی حال فارسی کا بھی ہے۔ فارسی کے بہت سے لفظ اور ترکیبیں ہیں جن کو ہم نے اپنے ہندوستانی معنوں کے لیے ہندوستانی لفظ بنا لیا ہے۔ فارسی میں خانہ لگا کر ظرف اور مقام کے معنی میں لفظ بنا لیے گیے ہیں جن کی صورت تو فارسی کی ہے۔ مگر معنی اور استعمال سراسر ہندی ہیں، جیسے پاخانہ، غسل خانہ، طہارت خانہ، باورچی خانہ، بندی خانہ، کیل خانہ۔ اسی طرح فارسی میں دان لگا کر بھی ظرف بنتا ہے جیسے خاکدان یعنی زمین۔ ہندوستان میں اس سے ہم نے بیسیوں لفظ بنائے جیسے پاندان، اگالدان، خاصدان، عطردان، قلمدان، جزدان، چائے دان دودھ دان، شکردان، روشن دان، ناددان، سنگاردان، شمع دان۔

تصغیر کے لیے دان کو ہم نے کبھی دانی بھی کر دیا۔ جیسے سرمہ دانی، گوند دانی مچھر دانی، تلے دانی (سوئی تاگا رکھنے کے لیے)

گیر۔ (لینے والا) لگا کر فارسی میں اسم مرکب بنائے جاتے ہیں، جیسے دگیر، جہانگیر، ہم نے اس سے لفظ بنا کر بہت سی چیزوں کے نام رکھ دیے، جیسے خوگیر، (خو کے معنی فارسی میں پسینہ کے ہیں) عرق گیر، کفگیر، نمگیر (نم یعنی شبنم) چونکہ اس م کے خیموں سے شبنم سے بچاؤ مقصود ہے اس لیے نمگیر کہہ دیا) دیوار گیر، پہلے اس کپڑے کو کہتے تھے جو دیوار پر آرائش کے لیے لگاتے تھے، تاکہ دیوار سے پیٹھ ٹیکنے میں کپڑا خراب نہ ہو، اب اس لیمپ کو کہتے ہیں جو دیوار میں لٹکایا جائے۔

اس سلسلہ میں جاگیر تاریخی لفظ ہے، جاگیر کے لغوی معنی تو جگہ لینے والا ہیں بادشاہ اپنے امیروں کو منصب کے ساتھ جو گاؤں دیتے تھے، جہاں جا کر امرا اکثر قیام کرتے تھے اس کو جاگیر کہنے لگے، رفتہ رفتہ جاگیر کے خاص معنی ہو گئے یہاں تک کہ غریب طالب علموں کے کھانے کے ٹھکانے کو بھی جاگیر کہنے لگے۔

اسی سے ملا ہوا جاداد کا لفظ ہے۔ فارسی لفظ کی اصل صورت جائداد ہے معنی دی ہوئی جگہ۔ بادشاہ کی طرف سے امیروں کو جو گاؤں ملتے تھے، وہ جائداد تھی، رفتہ رفتہ جاداد نے زمینداری اور ملکیت کے معنی پیدا کر لیے۔ زمیندار اور زمینداری بھی لفظوں میں فارسی ہیں اور معنوں میں سراسر ہندی۔

تنخواہ کے لفظی معنی اسم مفعول کی ترکیب سے "بدن کا چاہا ہوا" جیسے دلخواہ، دل کا چاہا ہوا۔ معنی یوں پیدا ہوئے کہ مغلوں کے زمانہ میں سرکاری امیروں کو خوراک وغیرہ کے لیے جو معاوضہ ملتا تھا، اس کا نام تنخواہ رکھا گیا، اب تنخواہ کے معنی شاہرہ کے ہیں، ایرانی اس تنخواہ کے لفظ سے بھی واقف نہ ہوں گے۔

ہندوستانی نے یہی عمل ہندی اور سنسکرت کے لفظوں کے ساتھ کیا ہے ہندی اور سنسکرت سے لفظوں کو اپنانے کے لیے ان کی شکلیں بدلی ہیں۔ ان کو ہلکا کیا ہے، ان کی ترکیبوں سے نئے نئے لفظ بنائے ہیں۔

مہنال، منہ ہندی ہے۔ نال، نالی اور نلی لمبی سوراخ دار چیز کو کہتے ہیں۔ جیسے بندوق کی نال ویسے ہی نیچہ کی نال کے منہ پر جو لگایا جائے وہ مہنال ہے، گنگا اور جمنا دو دریاؤں کے نام ہیں، سونے چاندی کے ملان سے جو نقاشی کی جائے وہ گنگا جمنی ہے لفظ برہمنڑ تھا، جو ذرا بھاری تھا، اس کو ہماری زبان نے برہمن کر دیا، اسی طرح گنڑ کو گُن کر کے اس کو ہلکا کر دیا، برکھارت نے برسات کی شکل اختیار کی، وچار بچار ہو گیا اور سوچ بچار کے ساتھ بولا جانے لگا، آشا نے آس ہو کر یہ مثل کہلوائی کہ جب تک سانس ہے تب تک آس ہے اس طرح ہندی اور سنسکرت کے لاتعداد لفظوں کو ہندوستانی نے ذرا ذرا ہیر پھیر سے اپنے رنگ میں رنگ کر ان پر زمانے کے تغیر کا نیا رنگ چڑھا دیا ہے۔

غرض عربی اور فارسی اور سنسکرت نسل کے ان ہندوستانی بچوں کی تعداد بے شمار ہے۔ یہاں ان سب لفظوں کو پہچنوانا اور بہت مقصود نہیں، مقصود یہ ہے کہ آج ہمارے سنسکرت دوست دوستوں کی جو یہ کد ہے کہ ہندوستانی زبان کے ہر ہندی یا سنسکرت لفظ کو صحیح ہندی اصل اور صحیح سنسکرت رنگ روپ میں دیکھیں اور اسی صحیح ہندی سنسکرت نام سے ان کو پکاریں، ان کو تسلی رہے کہ ہندوستانی نے عربی اور فارسی لفظوں کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا ہے اور ہر خود مختار زبان کو اس کا حق ہے کہ وہ دوسری زبان کے لفظوں کو اپنی رعایا بنانے کے لیے ان کے ہاتھ یہ سلوک کرے یہ ہر خود مختار زبان کا حق ہے اور کسی کی قدرت میں نہیں کہ وہ اس سے اس کے حق کو چھین سکے

(معارف ماہ جون ۱۹۳۹ء)

اکبر کا ظریفانہ کلام

ولی دکھنی سے لے کر میر و داغ و جلال کے زمانہ تک ہماری شاعری جس تنگ و محدود شاہراہ پر چل رہی تھی، اہل محفل کا دل اس سے آتنا اکتا گیا تھا، کہ اگر نئے راستے پیدا نہ ہوتے تو اردو شاعری فنا ہو چکی ہوتی، مولانا شبلی کی تاریخی شاعری، مولانا حالی کا پند و موعظت، مولوی اسماعیل میرٹھی کی اخلاقی کہانیاں، ڈاکٹر اقبال کا فلسفہ، میر اکبر حسین کی پر معنی اور لطیف ظرافت اردو شاعری کی جدید تاریخ کے شاندار ابواب ہیں۔

ارباب تجارت دو طرح کے ہیں۔ ایک وہ جو بازار کا چلن دیکھ کر اپنی دوکان میں ہر ضرورت کی چیزیں ادھر ادھر چن دیتے ہیں، خریدار راستہ سے گذرتے ہیں اور اپنی پسند اور ضرورت کے مطابق دوکان سے مختلف چیزیں اٹھا لیتے ہیں، ان دوکانداروں کو پھر جو سستی اور چلتی ہوئی چیزیں نظر آتی ہیں ان کو لے کر اپنی دکان سج لیتے ہیں۔ دوسرے وہ سوداگر ہیں، جنھوں نے اپنے مذاق اور استعداد کے مطابق کوئی چیز پسند کر لی ہے، اور وہی ایک جنس ان ہی کی دوکان میں ملتی ہے، اگر تم کو کسی اور چیز کی ضرورت ہو تو اسی قسم کی کوئی اور دوکان تلاش کرو جہاں صرف اسی جنس کی تجارت ہوتی ہو، عموماً بڑے بڑے تاجر اسی دوسری قسم کے ہیں۔

شاعری کا بھی یہی حال ہے، فردوسی، سعدی، حافظ شیرازی، خیام نیشاپوری، عرفی شیرازی جن کا کلام قبول عام حاصل کر چکا ہے، تھوک فروش

سوداگر تھے۔ ان کے یہاں شاعر کے مذاق کے مطابق کلام ملے گا۔ ان میں ناظرین کے مذاق و انتخاب سے بحث نہیں۔ ایک شاعر و خطیب میں سب سے بڑا نازک فرق یہی ہے کہ شاعر دنیا کو صرف اپنا دل دکھلاتا ہے، خطیب سامعین کے دل دیکھتا ہے اور ان کے خیالات و جذبات کو متاثر کرنا چاہتا ہے، یہی سبب ہے کہ تمام بڑے بڑے شعراء کا ایک خاص رنگ مذاق ہے، جس کے مطابق وہ اپنے کلام کو فروغ دیتے ہیں۔

قدیم شعرائے اردو میں میرؔ، غالبؔ، انشاؔ اور نظیرؔ اکبرآبادی کے سوا کسی اور کا مخصوص موضوعِ سخن نہیں، جدید شاعری کے ہماری زبان پر دو بڑے احسانات ہیں، ایک تو غزل اور قصیدہ کے متفرق و پراگندہ خیالات کے بجائے عربی شاعری کی طرح مسلسل مضامین کی اس نے بنیاد ڈالی، دوم یہ کہ زلف و شانہ کے الجھاؤ اور گرفتاری سے اس نے نجات پائی اور ہر قسم کے مسلسل خیالات شعر میں بندھنے لگے، ہماری تعلیم اور عام فضل و کمال کے مشاہیر جس طرح اب تک وہی قدیم تعلیم یافتہ تھے، جنھوں نے بوریا نشین ہو کر تعلیم پائی اور اب تک قومی اسٹیج کے وہ مالک تھے، اسی طرح جدید شاعری کے میدان میں بھی وہی بزرگوار پیشرو ہیں، جنھوں نے قدیم شاعری سے اکتا کر اس نئے کوچہ میں قدم رکھا۔

مولانا حالی اور میر اکبر حسین دونوں قدیم شاعری کے استادِ مسلم الثبوت ہیں، ان کے دیوانوں کا ایک حصہ ان ہی قدیم غزلوں کا مجموعہ ہے جن کے شکست و ریخت میں عمر کا بڑا حصہ ضائع کیا گیا ہے، میر صاحب غالباً وحید الہ آبادی کے شاگرد ہیں جن کو آتش یا ناسخ سے شرفِ تلمذ حاصل تھا، اسی بنا پر میر صاحب کی شاعری میں لکھنؤ کا مذاق نہایت نمایاں ہے اور وہی رنگ طبیعت نکھر کر ایک اور عالم بن گیا ہے۔ اب تک ان کے دو دیوان شائع ہو چکے ہیں، کلام کی تقسیم مختلف مضامین پر ہے، لیکن درحقیقت ہم ان کو صرف تین جلی تقسیمات میں درج کرتے ہیں، غزلیں، سنجیدہ و متین کلام اور ظریفانہ نظمیں، اول اور دوم صنفِ سخن سے یہاں کوئی بحث نہیں، صرف تیسری صنف کے متعلق کچھ کہنا ہے۔

لکھنؤ کے شعرا میں سید انشا (لکھنؤ آگر) اور امانت لکھنوی کا جو رنگ ہے میر صاحب کی ظریفانہ نظموں کا درحقیقت وہ اساس سخن ہے، آج سے تیس برس پہلے لکھنؤ سے اودھ پنچ کے نام سے ایک اخبار نکلا تھا اور مدت تک زندہ رہا۔ میر صاحب کے فطری رنگ کی پختگی میں اس اخبار سے بڑی مدد ملی۔ اس کی ہفتہ وار اشاعتوں میں میر صاحب کا کلام خاص ذوق سے لوگ پڑھا کرتے تھے اودھ پنچ کے گر جانے کے بعد اور ماہوار رسائل میں بھی میر صاحب کا کلام چھپ کر مطبوع ہونے لگا اور اب ہماری زبان کا ہر ممتاز رسالہ اور اخبار ان کے اشعار کے لیے ہر مہینہ بے قرار رہتا تھا۔

میر صاحب کا اعلیٰ مذاق اور ان کی شاعری کا موضوع عام پُر معنی اور سنجیدہ ظرافت ہے۔ ان کو مذہب، فلسفہ، سیاست، قومیات جس موضوع پر بھی جو کچھ کہنا ہوتا، اس کا مغز سخن جو کچھ ہو لیکن اس کا قشر بالائی صرف سنجیدہ ظرافت ہوتی ہے، ظرافت کا رنگ جو سید انشا اور سعادت علی خاں کی بدولت لکھنؤ کی شاعری میں پیدا ہو گیا تھا، اس کا مقصد صرف تفریح طبع اور دل بہلانا تھا، ضلع اور رعایت لفظی لکھنؤ کا خاص مذاق ہے، اس کا مقصد بھی محض تفنن طبع تھا، اور لکھنؤ میں امانت اس اقلیم کا بادشاہ ہوا ہے۔ جان صاحب کا ظریفانہ رنگ گو زنانہ لہجہ میں آکر بدنما ہو گیا تھا، تاہم اس کی بنیاد بھی محض تفریح طبع پر تھی، میر صاحب کا احسان یہ ہے کہ انھوں نے سعدی بن یمین اور خیام کے مغز سخن کو امانت کے الفاظ میں اور سید انشا کی بولی میں اس طرح ادا کیا کہ وہ نہ صرف تفریح طبع اور واہ واہ کا سامان رہا، بلکہ اس کی تہ میں پند و موعظت اخلاقی تعلیم، سیاسی نکتے، فلسفیانہ اسرار، مذہبی مسائل، اجتماعی مباحث بھی نظر آنے لگے، سید انشا کے زمانے کی سرکاری زبان فارسی اور ترکی تھی، وہ اسی شیرہ اور قوام سے اپنا شربت تیار کرتے تھے، اب انگریزی سرکاری زبان ہے میر صاحب اس بادہ فرنگی کی آمیزش سے ذوق کلام کو لطف دیتے ہیں۔

ہم اوپر کہہ آئے ہیں کہ میر صاحب کے اصناف کلام میں گو ہر جنس کی چیزیں ملتی ہیں لیکن ان کے کلام میں لذت درحقیقت ظرافت کی ہوتی ہے، جس کے مزے سے

دل اور زبان دونوں لطف اٹھاتے ہیں۔ میر صاحب اسی شیر و شکر میں پند و موعظت اور نصیحت گری کی ان تلخ دواؤں کا گھونٹ گلے سے اتار دیتے ہیں جن کو یوں پینا اس جدید دور لطافت و تنزہ پسندی میں ناممکن تھا۔ میر صاحب بھری محفل میں علمائے کرام، مشائخ عظام، امراء و حکام، مدعیان رہبری عام اور نوجوان تعلیم یافتوں کا خاکہ اڑاتے ہیں اور ان کی جبینوں پر میل تک نہیں آتا۔

میر صاحب کا اصل رنگ یہ ہے کہ جدید طرز معاشرت، یورپین اخلاق و عادات، تعلیم جدید کے نقائص، مغربی تقلید کے معائب کو ظرافت کے پردے میں اس طرح نمایاں اور واضح کریں کہ مخاطب جھینپ کر خاموش ہو جائے اور اپنے فعل پر تھوڑی دیر کے لیے اس کے چہرے پر ندامت سے پسینہ آجائے۔ کہتے ہیں۔

ہر چند کہ کوٹ بھی ہے پتلون بھی ہے
بنگلہ بھی ہے، پاٹ بھی ہے صابون بھی ہے
لیکن میں تجھ سے پوچھتا ہوں ہندی
یورپ کا تری رگوں میں کچھ خون بھی ہے

آگاہ ہوں معنی خوش اقبالی سے
واقف ہوں بنائے رتبۂ عالی سے
شرطیں عزت کی اور ہیں اکبرؔ!
چلتا نہیں کام صرف نقالی سے

تعلیم میں ان علوم کے ہو مصروف
نیچر کی جو طاقتوں کو کر دے مکشوف
لیکن تم سے امید کیا ہو کہ تمھیں
عہدہ مطلوب ہے وطن ہے مالوف

مذہب کی کہوں تو دل لگی میں اڑ جائے
مطلب کی کہوں تو پالسی میں اڑ جائے
باقی سر قوم میں ابھی ہے کچھ ہوش
غالب ہے کہ یہ بھی اس صدی میں اڑ جائے

میر صاحب کی ظریفانہ شاعری پر اگر تنقید کی نگاہ ڈالی جائے تو معلوم ہو گا. کہ ان کی ظرافت کے مختلف سات عنصر ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل عنوانوں میں کی جا سکتی ہے۔

رعایت لفظی یا ضلع جگت

دنیا میں کوئی چیز بری یا بھلی نہیں ہے، ہر چیز کا محل استعمال برا یا بھلا ہے، ضلع جگت درحقیقت ایک بازاری چیز ہے، اس لیے سنجیدہ کلام اس کو متحمل نہیں ہو سکتا، امیر خسرو نے اعجاز خسروی کے ذریعہ اس عالم میں اپنی پیمبری کا لاکھ ثبوت دیا، لیکن اہل ہوش و خرد کے نزدیک مقبول نہ ہوئی۔

رعایت لفظی اور ضلع جگت متاخرین بلکہ متوسطین شعرائے لکھنؤ تک کا مذاق خاص رہا ہے، اکثر صرف اسی اساس پر ان کی شاعری کی ساری بنیاد قائم ہوتی ہے، ان لوگوں نے بڑی غلطی یہ کی کہ اس کا کوئی خاص محل استعمال متعین نہیں کیا، بلکہ ہر قسم کے کلام کو اس زیور سے آراستہ کرنا چاہا، یہی وجہ ہے کہ وہ اونچے طبقوں میں مقبول نہیں ہوا، لیکن میر صاحب نے رعایت لفظی کو صرف ظریفانہ کلام کے ساتھ مخصوص کر دیا، جو اس کے لیے خاص طور سے موزوں تھی، میر صاحب کے ظریفانہ کلام کے رنگ کو جا بجا اسی عنصر کی آمیزش نے نہایت شوخ کر دیا ہے، مثلاً گولیاں دوا کی بھی ہوتی ہیں اور بندوقوں کی بھی، اس تجنیس سے دیکھو میر صاحب کس طرح فائدہ اٹھاتے ہیں

گولیوں کے زور سے کرتے ہیں وہ دنیا کو ہضم
اس سے بہتر اس غذا کے واسطے چورن نہیں

رسالہ کی تجنیس سے دیکھیے کس طرح کام نکالتے ہیں،

ملکی ترقیوں میں دوالے نکال لیے
پلٹن نہیں تو خیر رسالے نکال لیے

مس کی تجنیس دیکھیے کیا رنگ دکھاتی ہے،

سراسر نور تقوی سایہ پر قربان کر آئے
یہ کیا اچھا کیا تم نے اگر زر کھو کے مس لائے

تثلیث اور تین

شیخ تثلیث کی تردید تو کرتے نہیں کچھ
گھر میں بیٹھے ہوئے وَالتّین پڑھا کرتے ہیں

اس رعایت لفظی اور تجنیس کے شوق میں بعض اوقات وہ اردو، انگریزی

دفارسی الفاظ کو بھی باہم متجانس کر لیتے ہیں اور اس میں بھی ایک لطف پیدا ہو جاتا ہے "ہمبل" انگریزی میں خاکسار کو کہتے ہیں، وہ اس کو امام حنبل بناتے ہیں،

ہر طرح ہے اب عاجزی ہم میں　　　اب ہمارے امام حنبل ہیں

پاس کرنا اور پاس رہنا۔

لندن میں بگڑ جاؤ گے وسواس یہی ہے
تم پاس رہو میرے بڑا پاس یہی ہے

گڈ ڈے اور گڈے،

ضرورت کچھ نہ تھی اس کی کہ آپس میں بھی ہو جائے
سلام ورحمۃ اللہ کی جگہ گڈ نائٹ و گڈ ڈے
حیات مذہبی سے بھاگتا تھا کھیل گڑیوں کا!
کہاں کی قوم، ہاں کچھ بن گئے ہیں نازنیں گڈے

کم آل اور کمال،

ساری دنیا ہے اس کو پیاری اکبر
کہتا ہے "کم آل" جس کو حاصل ہے کمال

کم آل (تم سب آؤ) اور کمال کی تجنیس صوتی اس ظرافت کی بنیاد ہے،

جدت قافیہ

میر صاحب کی ظرافت کا بڑا کھیل اکثر اوقات قافیہ کی جدت ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ وہ اکثر انگریزی الفاظ کو بطور قافیہ کے استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً

ہوائے طوبیٰ ہے اب نہ سر میں نہ موجِ کوثر ہے اب نظر میں
ہوس اگر ہے تو بس یہی ہے، کہ ہم بھی چھپ جائیں پانیر میں

اک دن وہ تھا کہ دب گئے تھے لوگ دین سے
ایک دن یہ ہے کہ دین دبا ہے مشین سے

خواہش ہو تجھے اگر غنی بننے کی　　　دولت کی ہوس ہے اور دھنی بننے کی

شخصی حالت کو چھوڑ اے ہندی   کوشش لازم ہے کمپنی بننے کی

بلبل ہیں آج ہم چمنستانِ کیمپ کے
پروانہ کل بنیں گے کلیسا کے لیمپ کے
فکرِ بہشت و کوثر و تسنیم ہو چکی
اب پارک کا خیال ہے چرچے ہیں ہمپ کے
رکھتے تھے جو بزرگ قدم پھونک کر
خوگر ہوئے ہیں لیپ کے اسکیپ کے جمپ کے

عینک آنکھوں میں مصنوعی ہیں دانت   نیچر نے سکھا کے کر دیا جسم کو تانت
اب تک ہے وہی مگر ہوس حضرت کی   ہے طول امل ہنوز شیطان کی آنت

نہ نماز ہے، نہ روزہ، نہ زکوٰۃ ہے، نہ حج ہے
تو خوشی پھر اس کی کیا ہے کوئی جنٹ، کوئی جج ہے

بعض الفاظ ایسے ہیں جو قافیہ نہیں بنتے، لیکن میر صاحب اس قسم کے الفاظ کی ترکیب سے بعض موقعوں پر قافیہ کا کام لیتے ہیں، اس لیے اس سے نہایت ندرت اور جدت پیدا ہو جاتی ہے، مثلاً

پنڈت بیٹھا ہے اپنی پوتھی لے کر   بنیا بیٹھا ہے موٹھ موتھی لے کر
سودا اس کو ہے جو سدھار النذن   وہ دولت وجش گھر میں جوتھی لے کر

پوتھی، چوتھی کا قافیہ جوتھی کتنا عجیب ہے،

میر صاحب کو قافیہ نکالنے میں کمال حاصل تھا، مولانا شبلی فرماتے تھے کہ ایک دفعہ میں نے ان سے کہا کہ میرے نام کا قافیہ نکالیے تو جانیں، وہ اس وقت چپ رہے، تھوڑی دیر کے بعد میر صاحب نے دعوت کا رقعہ بھیجا:

آتا نہیں مجھ کو قبلہ قبلی!
ہے بات یہ صاف بھائی شبلی

قبلہ قبلی اور شبلی کا قافیہ ان ہی کی تلاش سے مل سکتا تھا۔

مخاطب کے دعوی کی تشریح

میر صاحب کے کلام میں بعض وقت ظرافت اس طرح پیدا ہوتی ہے کہ مخاطب کے دعوی کو صحیح تسلیم کر لیتے۔ لیکن اس کی تشریح اس طرح کر دیتے ہیں کہ مدعا بالکل اس کے مخالف ثابت ہوتا ہے، مثلاً موجودہ بیداری سید احمد خاں کی کوششوں کا نتیجہ خیال کی جاتی ہے میر صاحب اس کو تسلیم کرتے ہیں، مگر کہتے ہیں، کہ اس میں للٰہیت اتنی ہو کہ لوگ اٹھتے وقت اللہ کا نام لیں۔

سید صاحب سکھا گئے جو شعور کہتا نہیں تم سے کہ اس سے نفور
سوتوں کو جگا دیا انھوں نے لیکن اللہ کا نام لے کے اٹھنا ہے ضرور

جدید تعلیم یافتہ گروہ کالج کو تمام قومی کاموں کو تنہا واحد مرکز بتاتا ہے، میر صاحب اس کے اس دعوی کو تسلیم کرتے ہیں، لیکن اسی طرح واحد اور ایک، جس طرح ایک بے مایہ کی ایک واحد جھونپڑی یا اندھے کی ایک لکڑی۔

مسلمانوں نے کالج کی بری کیا راہ پکڑی ہے
وہی تو ایک ٹھکانا ہے، وہی اندھے کی لکڑی ہے

جدید تہذیب کے دلدادہ بے پردگی کے حامی اور عورتوں کو پبلک مجمع میں دیکھنے کے مشتاق ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ جو انگریزی نہ جانے گویا وہ تعلیم سے عاری ہے، میر صاحب ان کے دعوی کی تشریح ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

حامدہ چمکی نہ تھی، انگلش سے جب بیگانہ تھی
اب وہ شمع بزم ہے، پہلے چراغ خانہ تھی

شمع بزم اور چراغ خانہ کی تشریح سن کر عجب نہیں کہ عورتوں کی بے پردگی اور انگریزی تعلیم کے مدعی بے چراغ پا ہو جائیں۔

ابہام

یعنی کسی فقرے کے دو مطلب ہوں، قریب تر غیر مقصود اور بعید تر

مقصود ہو۔

یورپ والے جو چاہیں دل میں بھر دیں
جس کے سر پر جو چاہیں تہمت دھر دیں
بچتے رہو ان کی تیزیوں سے اکبر
تم کیا ہو خدا کے تین ٹکڑے کر دیں

تین ٹکڑے کر دینے سے قطع و برید نہیں، تثلیث مراد ہے، لیکن ایہام قطع و برید کا ہوتا ہے، اور یہی اس شعر کا لطف ہے۔

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں
اکبر زمیں میں غیرتِ قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو میں نے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا
کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کے پڑ گیا

بظاہر اس سوال کا جواب ہے کہ پردہ اس لیے نہیں ہے، کہ وہ مردوں نے چھین لیا، لیکن اصل مقصود یہ ہے کہ مردوں کی عقل پر پردہ پڑ گیا اور اپنی عورتوں کا پردہ انھوں نے اٹھا دیا۔

بوٹ ڈاسن نے بنایا میں نے اک مضموں لکھا
میرا مضموں رہ گیا، ڈاسن کا جوتا چل گیا!

جوتا چل گیا کے دو معنی ہیں، ایک مقصود، دوسرا غیر مقصود۔

قدیم شعراء کے خیالات کو دوسرے پیرایہ میں ادا کرنا

میر صاحب بعض اوقات قدیم شعراء کے خیالات اس طرح الٹ پلٹ کر دیتے ہیں کہ قدیم و جدید مضامین میں ایسی دلآویز مناسبت پیدا ہو جاتی ہے، جس سے بے ساختہ ہنسی آ جاتی ہے، سعدی کے ایک شعر کا مصرع ہے

چہ بر تخت مُردن چہ بر روئے خاک

وہ اس کو یوں پلٹتے ہیں،

چو مسٹر نباشد ترا میہماں
چہ بر میز خوردن چہ بر روئے خواں

مولوی روم کا شعر ہے،

چیست دنیا از خدا غافل شدن   نے قماش و نقرہ و فرزند و زن

اس کو یوں کیا ہے،

نیچریت چیست از دیں گم شدن   نے قمیص و کوٹ و پتلون و بٹن

ابر و باد و مہ و خورشید در کار اند   تا تو نانے بکف آری و بغفلت نخوری

اس شعر کو یوں کیا ہے

کالج و ٹیچر و حکام در کار اند!   تا تو "پاسے" بکف آری و کنی عہدہ بری

جدید محاورات

میر صاحب کے کلام کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ جدید محاورے جو انگریزی زبان کے اختلاط سے پیدا ہو گیے ہیں، ہمارے مشرقی شاعر تو ان کا استعمال عام، عارِ کلام سمجھیں گے، لیکن میر صاحب انھیں محاورات کو پیرایۂ اشعار میں اس طرح جلوہ دیتے ہیں کہ ہزاروں محتاط شاعروں کو ان پر قربان کر دینے کو جی چاہتا ہے۔

بیٹھا رہا میں صبح سے اس در پہ شام تک
افسوس ہے ہوا نہ میسر سلام تک
ہر اک ریمارک آپ کا عقرب کا نیش ہے
مجھ کو بجا ہے رنج غیر کا سینہ بھی ریش ہے
حریفوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں
کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

تشبیہ و استعارات کی جدّت

کلام میں نئی تشبیہیں پیدا کرنا۔ شاعری کی جنت کا شجرِ ممنوعہ ہے، عرب میں تشبیہات بالکل مادی اور سادی ہوتی تھیں، ایران اگر عربی شاعری باغ و

بہار بن گئی، فارسی شاعری جب ہندوستان آئی، تو گو شیراز کا بلبل ہاتھ سے نہ چھوٹا، لیکن فاختہ اور قمری کی کوکو بھی اب سنائی دینے لگی، اس نئے دور تجربات میں سینکڑوں چیزیں نئی پیدا ہو گئی ہیں، لیکن ہماری قدیم شاعری کا ذخیرۂ تشبیہات اب تک وہی سلف کا متروکہ اور اندوختہ چلا آتا ہے، میر صاحب کا احسان ہے کہ انھوں نے بیسیوں نئی تشبیہیں کلام میں پیدا کر دیں اور ان سے عجیب و غریب تمثیلی استدلالات پیدا کیے۔

زندگی اور قیامت میں ریلیشن سمجھو
اس کو کالج اور اسے کانووکیشن سمجھو
آہ و فریاد سے قابو میں نہ آئے گا دل
تپشِ قلب کو بنگال ایجی ٹیشن سمجھو
بحرِ ہستی کا یہی دور چلا جاتا ہے
برف کی طرح جمے، بہ گئے پانی کی طرح
میدانِ عمل لیگ کا محدود ہے بیشک
ہاں قبر مجلس کی کوئی تاب نہیں ہے
ہے کوما ہی کوما جو پڑھے دہر کا نامہ
جز موت کہیں اس میں فل اسٹاپ نہیں ہے
بعد مُردن کچھ نہیں یہ فلسفہ مردود ہے
قوم ہی کو دیکھیے مردہ اور موجود ہے
کل مست عیش و ناز تھے ہوٹل کے ہال میں
اب ہائے ہائے کر رہے ہیں اسپتال میں
دنیا سے قرار دو اور آخرت ہے یہ
سن لو کہ سازِ معنی اکبرؔ کی گت ہے یہ

(معارف اگست سنہ ۱۹۱۶ء)

ہندوستان کی تاریخ کیسی لکھی جائے*

مولانا سید سلیمان ندوی رحؒ نے آل انڈیا ہسٹری کانگریس شعبۂ تاریخ ہند از منہ وسطیٰ (سنہ ۱۲۰۶ء سنہ ۱۵۲۶ء) کے جلسہ منعقدہ مدراس دسمبر سنہ ۱۹۴۴ء کی صدارت کی، ان کے خطبۂ صدارت کے کچھ ٹکڑے ذیل میں ہدیۂ ناظرین ہیں۔ " س ع

رفیقو! ممنون ہوں کہ آپ نے اپنی مجلس میں اس کرسی پر مجھے جگہ دی، آپ نے اس انتخاب سے اپنے دستور کی کئی دفعوں کو توڑا ہے۔ آپ نے یہ کرسی ایسے شخص کو دی ہے جس کو آپ کی یونیورسٹی برادری سے دور کا بھی لگاؤ نہیں۔ بلکہ اس نے آپ کے اسکول اور کالج میں ایک منٹ کے لیے بھی قدم نہیں رکھا، اور وہ سرتاپا مشرقی درسگاہوں کا پروردہ اور نمائندہ ہے، اس لیے اس اعزاز کے لیے اس کا انتخاب آپ کی رواداری اور دل کی بڑائی کا بہت بڑا ثبوت ہے، آپ نے اس طرح میرا حوصلہ بڑھایا ہے، جس کا دل سے شکرگذار ہوں اور اس کو اس کے لیے نیک فال سمجھتا ہوں، کہ شاید آئندہ علمی اور تعلیمی کاموں کے انجام دینے میں مشرقی اور مغربی تعلیموں کے فرق و امتیاز کی خلیج بیچ میں نہ آئے گی اور ہماری نظر کسی بڑے علمی اور تعلیمی مقصد کو پورا کرنے میں اصل مقصد پر رہے گی، مغربی و مشرقی طرز و انداز کے اختلاف پر نہیں۔

اب ہم زمانے کے دوسرے موڑ پر پہنچ گئے ہیں، جہاں ہم کو اپنی زبان سے

محبت ہونی چاہیے اور اپنی دیسی ہندوستانی زبان میں کام کرنے والوں کے ساتھ اشتراکِ عمل ہونا چاہیے اور شاید آج کا دن اس مقصد کے اعلان کے لیے موزوں ہے۔

اصل موضوع پر کچھ کہنے سے پہلے ہندوستان کی عمومی تاریخ کے ایک خاص نقطۂ نظر کے متعلق ہم کو کچھ کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے، ہم جس چیز کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں، ہمارے خیال میں اب تک کسی جماعت کی طرف سے اس کی غلطی کو واضح نہیں کیا گیا اور نہ اس کی غلطی پر ابھی تک ٹوکا گیا ہے۔ ہماری مراد اس سے وہ غلط قسم کا فرقہ وارانہ رنگ ہے جو ہماری تاریخ پر ایک زمانہ سے چھایا ہوا ہے۔

پالیٹکس کے کھیل سے اس ملک کا علم تاریخ بھی بچا ہوا نہیں، بلکہ صاف کہنا چاہیے کہ یہی وہ بیج ہے جس سے ہندوستان کا مشہور پھل "پھوٹ" پیدا ہوتا ہے، مسلمانوں کی حکومت کی بڑائی اور اچھائی کی بھی بہت سی باتیں کہی جا سکتی ہیں، مگر ان کے بعد اس ملک میں جو حکومت آئی، اس کے زمانہ میں تعلیم کا سررشتہ غیر ملکیوں کے ہاتھ میں تھا، ان لوگوں کے ہر جتھے کی طرف سے یہ کوشش تھی کہ اپنے راج کی بڑائی کو ہر ہندوستانی دل میں بٹھا دے اور ساتھ ہی ایک ایسا کرتب کرے جس سے ان کے دل کے شیشے ٹوٹ کر پھر جٹنے نہ پائیں، تعلیم کے سارے مضمونوں میں اس کام کے لیے تاریخ کے سوا کوئی اور چیز مناسب نہ تھی، چنانچہ انھوں نے اس ملک کے لیے تاریخ کی جو کتابیں شروع سے آخر تک لکھیں اور پڑھائیں، ان میں یہی بات سو سو طرح سے الٹ پلٹ کر سمجھائیں اور پڑھائیں، کہ جو دل ان سے ٹوٹے تھے وہ پھر اب تک جٹ نہ سکے۔

آج سے کوئی پندرہ سولہ برس پہلے اسی مدراس کے ایک شہر ترچناپلی میں ہندو مسلمانوں کے ایک ملے جلے جلسہ میں جس کے صدر ہائی کورٹ کے ایک ریٹائرڈ جج تھے، میں نے کہا تھا کہ وہ زمین جس میں ہندو مسلمانوں کے پھوٹ کا درخت جمتا اور بڑھتا ہے وہ C سے شروع ہونے والے دو مکان ہیں، یعنی کالج اور کورٹ، میری بات کو ہنسی اور دل لگی نہ سمجھیے، بلکہ سوچیے کہ میرا کہنا کہاں

کہاں تک سچ ہے، پچھلی بڑی جنگ یعنی ماںٹیگو چیمسفورڈ ریفارم اسکیم کے بعد سے تعلیم کا کام خود ہندوستانیوں کے ہاتھوں میں آگیا ہے جس میں سے ایک تاریخ بھی ہے، اب ہندوستان کی تاریخ اکثر یونیورسٹیوں میں ہندوستانی ہی پڑھاتے ہیں اور ہندوستانی ہی کورس کی کتابیں بناتے ہیں اور تاریخ کے مختلف دور کے بادشاہوں کے حالات کی تحقیق پر کتابیں لکھاتے ہیں، لیکن یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ اب چلنے والے گو نئے ہیں لیکن ان کے چلنے کا راستہ ابھی تک وہی ہے، جس کو ان کے پہلے پرانے بدیسی چلنے والے بنا کر چھوڑ گئے ہیں، حالانکہ ضرورت یہ ہے کہ اب نیا ڈگر بنایا جائے اور علم کے قافلے کے چلنے والوں کے لیے نئی راہ نکالی جائے جو پھوٹ کے بجائے میل کی منزل مقصود کو جاتی ہو۔

اس فن کے جاننے والے جانتے ہیں کہ تاریخ ایک کچی دھات ہے، اس کچی دھات کو مختلف مسالوں سے جوڑ کر جیسی شکل آپ چاہیں بنا سکتے ہیں، اور اپنی ہمدردی اور بے دردی سے اس کو جس طرح چاہیں رنگ دے کر دکھا سکتے ہیں، دو تین جزئی باتوں کو ملا کر کلیہ بنا لینا اس فن کا آجکل سب سے آسان چٹکلہ ہے، پرانے زمانے میں تاریخ ایک معصوم فن تھا جس کا مقصد واقعات کا ریکارڈ تیار کرنا تھا اور بس، مگر آج کل یہ فن سب سے زیادہ بدنام فن ہو گیا ہے اور قوموں کی چرب زبانی، اختلاف بیانی اور واقعات کی توجیہ اور تشکیل کر کے اس کو جدا جدا رنگ دینے کے سبب سے کسی چیز کی تاریخ آج ایک ہی طرح بیان نہیں کی جا سکتی ہے، کچھ نہ ہی پچھلی جنگ ہی کی تاریخ مختلف لڑنے والی قوموں کی زبانوں سے ایک ہی طرح پڑھ کر دیکھ لیجیے، یا اسی لڑائی میں ایک ہی واقعہ کی روایت مختلف ملکوں کے ریڈیو میں سن لیجیے کہ اس زمانے میں تاریخ کی حقیقت کیا سمجھی گئی ہے اور اس سے کیا مصرف لیا جا رہا ہے۔

بہرحال مجھے یہ کہنا تھا کہ تاریخ کے فن کو قوموں کے پھوٹ اور میل میں بہت کچھ دخل ہے، اس لیے وہ لوگ جن کی نظر میں اس ملک کا مستقبل ہے اور جن کے ہاتھوں میں اس مستقبل کا بنانا یا بگاڑنا ہے، ان کو اپنی ذمہ داری سمجھنا چاہیے۔ اور اس حالت میں جب ہم سب کو معلوم ہے کہ ہم کو اب اسی ملک میں جینا اور مرنا ہے

تو عداوت اور نفرت کی پچھلی باتوں کو اس طرح دہراتے رہنا جس سے یہ جذبہ اسی طرح پلتا اور بڑھتا اور پھلتا اور پھولتا رہے، اپنے ملک کے ساتھ بڑی بے وفائی ہے

مسلمانوں میں دو مصنف ایسے گذرے ہیں، جنھوں نے ہندوستان کی خاک کو اپنی آنکھوں کا سرمہ بنایا جس میں پہلا گو نسل میں ترک تھا، مگر اس کا دل ہندوستان کی مٹی سے بنا تھا، میری مراد امیر خسرو سے ہے، جنھوں نے فارسی اور بھاشا کی آمیزش سے ہندوستان میں مسلمانوں کے عہد میں ایک نئی زبان اور نیا تمدنی ذوق پیدا کرنے کی کوشش کی اور سب سے پہلے اسی ملی جلی زبان میں شاعری کی بنیاد رکھی اور موسیقی کی ایک نئی لے ہندی اور ایرانی سے ملا کر پیدا کی، انھوں نے اپنی فارسی مثنوی،،، "نہ سپہر" میں ایک مستقل باب ہندوستان کی خوبیوں پر لکھا ہے اور یہاں کے ملکی باشندوں کے علم، آرٹ اور ہنر کی تعریف میں اپنی شاعری کا پورا جوہر دکھایا ہے دوسرے شخص میر غلام علی آزاد بلگرامی ہیں، جن کی وفات کو ابھی ۱۶۳ برس گذرے ہیں، ان سے بڑا ہندوستان کا کوئی مسلمان مؤرخ اور عربی کا شاعر اس ملک میں پیدا نہیں ہوا، یہ ہندی کے بھی شاعر تھے، بلکہ خاندانی شاعر، انھوں نے "سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان" عربی میں لکھ کر ہندوستان کی زمین کو آسمان بنا دیا اور ہر حیثیت سے اس کی اتنی بڑائی کی ہے کہ اس کو رشک جہاں بنا دیا ہے، مسلمان مورخوں کے لیے ان کے بزرگوں کا یہ طریقہ ان کی تقلید کے قابل ہے۔

جس عہد کی تاریخ پر ہم آج کی مجلس میں کچھ کہہ سن رہے ہیں اس پر ہندوستانی اہل قلم کے ہاتھوں کئی اچھی اچھی کتابیں شائع ہو کر اہل نظر کے سامنے آ گئی ہیں، خاص کر ہماری یونیورسٹیوں میں تاریخ کے کام کرنے والوں کے ذریعہ کافی لٹریچر پیدا ہو رہا ہے، مگر اس کا بڑا حصہ ہے ہے جو کسی یونیورسٹی سے کسی ڈگری کے حاصل کرنے کے لیے لکھا گیا ہے، اب تک عموماً طلبہ یا ایسے اساتذہ جنھوں نے اپنی طالب علمی کا زمانہ فوراً ہی ختم کیا ہے، ایک مقررہ وقت کے اندر ڈگری دینے والوں کے خیالات سے متاثر ہو کر اس عہد پر کتابیں لکھتے رہے ہیں، جن میں انھوں نے کم سے کم مدت میں زیادہ سے زیادہ باتیں پیش کرنے کی کوشش کی ہے، اسی لیے ان میں سے بعض کی تحقیق میں گہرائی، رائے میں پختگی اور دلیلوں میں وزن نہیں۔ ان میں کچھ ایسے بھی ہیں،

جنھوں نے فارسی نہ جاننے کے باوجود دوسروں پر بھروسہ کر کے اپنی تحقیقات کی ساری عمارت فارسی کی اوریجنل کتابوں پر کھڑی کر دی ہے اور بعض ایسے بھی ہیں جنھوں نے مسلمان حکمرانوں کے مذہب کے اصول و قوانین کا گہرا مطالعہ کیے بغیر کسی دوسرے کی رائے کا حوالہ دے کر یا کسی کے قول کو نقل کر کے اپنے خیال کے مطابق نتائج اخذ کر لیے ہیں، یہ دیکھ کر تعجب اور افسوس ہوتا ہے کہ بعض تاریخی تحقیقات میں اسلامی شریعت کی وضاحت انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کی مدد سے کی جاتی ہے اسلامی فقہ کے نکتے میکڈانلڈ کی کتاب کے ذریعہ سے بتائے جاتے ہیں، اسلامی مسائل کا حل ریورنڈ ھیو کی ڈکشنری آف اسلام سے پیش کیا جاتا ہے، مسلمانوں کی حکومت، بادشاہی اور مالیات کے نظریے آرنلڈ اور اگنائیڈز Aghnides کی عینک سے دیکھے جاتے ہیں۔

اس غلط نہج کار کا نتیجہ یہ ہے کہ اب گو نہ وہ فاتح رہے ہیں اور نہ مفتوح، مگر زمانہ کے تطاول سے اُن کے زمانہ کے پیدا شدہ جذبات کے سوکھ جانے والے درخت کو پانی دے دے کر ہرا کیا جاتا ہے اور ہم تحقیق کے نام سے اپنے پیش رووں کی غلطی کی غلط پیروی میں مصروف ہیں۔

یورپین مستشرقین نے اسلامی علوم و فنون کی جو خدمت کی ہے اس کا اعتراف ہے مگر مذہبی، شرعی اور فقہی معاملات میں ان کی تحقیق یا رائے یا قول پر کسی حال میں بھی اعتماد نہیں کیا جا سکتا، اس لیے مسلمان فرمانرواؤں کے کسی رویہ یا پالیسی کو ان کے مذہب کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش بھی کی جائے تو مذہبی معلومات کا ماخذ اور سرچشمہ خود مسلمان علماء و فقہا کی اوریجنل، مستند اور معتبر کتابیں ہونی چاہئیں، لیکن زبان کی ناواقفیت کی وجہ سے ان کتابوں کا سمجھنا ممکن نہ ہو تو پھر ایسے موضوع اور مسئلہ پر قلم اٹھانے کا حوصلہ ہی نہ کیا جائے، نیت خواہ کتنی ہی اچھی اور صاف ہو، مگر مذہبی مسائل کی غلط تعبیر اور ملکی امور میں ان کی غلط تطبیق سے بعض اوقات ایسے مضرت رساں پہلو پیدا ہو جاتے ہیں، جن سے ایک طرف تو حقیقت کا خون ہوتا ہے اور دوسری طرف قوموں کے جذبات میں تلخی پیدا ہوتی ہے۔

ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں نے اگر اپنی سیاست میں کوئی ناروا اور

نامناسب رویہ اختیار کیا، تو آج ہم کو اس کے لیے نہ معذرت نامہ پیش کرنے کی ضرورت ہے، نہ شرم سے سر جھکانے کی، وہ کون سی قوم ہے جس کے بادشاہ اور کشورکشا ہر معیار پر ہر زمانے میں پورے اترے، اور ہر اعتراض سے پاک گذرے، اچھوں اور بروں سے تاریخ کا کوئی دور خالی نہیں رہا۔ اس لیے شخص کی بحث میں مذہب کو درمیان میں لانا غلطی ہے، حالانکہ غلطی اس قسم کے موقعوں پر ہندوستان اور عیسائی ہندوستان کے دور کے بیان میں کبھی زیر عمل نہیں آتی۔ تاریخ کا مقصد پروپگنڈا نہیں، بلکہ وہ حکومتوں کی کہانی اور قوموں کی سوانح عمری ہے اور اسی حیثیت سے ان واقعات کا تذکرہ کرنا چاہیے، انگلستان کی تاریخ کیا لڑائی کا دنگل نہیں، رومن فتوحات سے موجودہ متحدہ اینگلو سکسن حکومت تک کیا وہاں قوموں کی جنگیں نہیں ہوئیں، کیا اسکاٹ لینڈ ویلز، آئرلینڈ اور انگلینڈ کے درمیان بڑی بڑی خونریزیاں نہیں ہوئیں، مگر اب ان کی تاریخ لکھتے وقت یہ خیال رکھا جاتا ہے کہ یہ واقعات اس انداز میں نہ بیان ہوں کہ پچھلے سوئے ہوئے فتنے پھر جاگ جائیں، انگلستان اور فرانس جو آج ڈیڑھ سو برس سے اتحادی ہیں کیا ان کی تاریخ کی زمین دونوں قوموں کے خون سے رنگین نہیں تاہم گذشتہ ناگواری کے اظہار میں قلم اس قدر محتاط رہتا ہے، کہ موجودہ خوشگواری کے شیشہ میں بال بھی نہیں آنے پاتا، اسی طرح پرانے ہندوستان کے راجاؤں کے عہد میں کس کا وقت لڑائی بھڑائی اور ایک دوسرے کے راج کے لینے دینے میں نہیں گذرا، پھر بھی بودھ، جین، ویدک، برہمنی، آریائی اور سیتھین اور یہاں کی قدیم باشندہ قوموں کی لڑائیوں کے بیان میں مؤرخوں نے اپنی قلمی لڑائیوں کا سلسلہ نہیں چھیڑا ہے حالانکہ ان میں سخت مذہبی اختلافات بھی تھے اور یہ صحیح قدم ہے۔ اسی طرح کا مصالحانہ قدم اسلامی تاریخ کے اس دور کے میدان میں بھی رکھنا چاہیے، میری یہ تمہید گو لمبی ہوگئی اور ممکن ہے کہ اس بیان میں کہیں کہیں سختی بھی آگئی ہو، مگر جس درد سے یہ باتیں کہی گئی ہیں امید ہے کہ اسی درد سے سنی بھی گئی ہوں گی اور ہمارے مؤرخ دوستوں کی توجہ کے قابل ٹھہریں گی، اس مجلس سے بہتر اور کون سا موقع اس درد کے اظہار کا ہو سکتا تھا۔

اب ہم ہندوستان کے اسلامی عہد کی تاریخ کی نسبت کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں

جو ہمارے پیش نظر ہے۔ اس عہد کی تاریخ لکھنے میں سب سے بڑی دقت یہ ہے کہ اس دور کی تاریخ کا سرمایہ ہمارے پاس بہت کم ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ تیموریوں کی طرح اس زمانہ کے بادشاہوں نے اپنے عہد کی تاریخ نویسی کو سرکاری کام نہیں قرار دیا تھا، بلکہ عموماً اہل تاریخ اس کام کو اپنے شوق سے انجام دیتے تھے۔ گو وہ کسی نہ کسی طرح بادشاہ کے دامن سے ضرور لپٹے تھے، تاہم وہ اس کام کے لیے متعین نہ تھے۔

آجکل قوموں کی تاریخ کی نقش آرائی میں خون ہی کا رنگ درکار نہیں، بلکہ اس زمانہ کا تمدن، اقتصاد، تعمیر، معاشرت، علم و فن اور طریق جنگ وغیرہ کے ایسے معلومات کی بھی ضرورت پڑتی ہے، جن سے اس قوم کی پوری تصویر کھڑی ہو جائے، لیکن اس زمانے کے پرانے مؤرخوں نے اپنے مذاق کے مطابق اپنی تاریخیں لکھیں، اس لیے جو مسائل ان کے نقطۂ نظر سے اہم تھے وہ ہمارے لیے غیر اہم ہیں اور جن مسائل کو ہم ضروری سمجھتے ہیں ان کو انھوں نے غیر ضروری سمجھ کر یا تو نظر انداز کر دیا ہے یا بہت ہی اختصار کے ساتھ لکھا ہے، تاہم اگر آجکل کے لکھنے والوں کے حوصلے بلند اور ارادے اونچے ہوں، تو ان ہی معاصر تاریخوں سے اپنی ضرورت کا اچھا خاصا مواد فراہم کر سکتے ہیں۔ میرے استاد مولانا شبلی فرمایا کرتے تھے، کہ وہ اپنی تحقیق میں چیونٹیوں کے منہ سے شکر کے دانے جمع کر کے مٹھائی تیار کیا کرتے ہیں، اگر اسی طرح صبر، محنت اور استقلال کی راہ دے کر کوئی ریسرچ کرنے کی کوشش کرے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہر موضوع پر اس کو ہر قسم کے معلومات نہ ملتے جائیں، مگر موجودہ دور کے محققین کے مشاغل اس قدر گوناگوں ہیں اور محنت کے وہ ابھی زیادہ عادی نہیں ہوئے ہیں، اس لیے ان کی کوشش صرف یہ ہوتی ہے کہ معاصر تاریخوں میں جو واقعات اور تفصیلات فارسی زبان میں سیدھے سادے طریقہ پر درج ہیں، وہ اپنے اپنے ذوق کے مطابق انگریزی اردو اور ہندی زبان میں تھوڑی تنقید اور نکتہ چینی کے ساتھ منتقل کر دیں، اسی طرح انگریزی اردو ہندی میں لٹریچر فراہم ہو کر ان زبانوں کی خدمت ہو جاتی ہے، یا اوسط درجہ کے علم اور تاریخی مذاق رکھنے والوں اور یونیورسٹی کے طالب علموں کے لیے تو کتابیں حاصل ہو جاتی ہیں، مگر ان تحقیقات سے صحیح معنوں میں گذشتہ عہد کی قوموں کی موجودہ نسلوں کی نہ ذہنی پیاس بجھتی ہے اور نہ وہ اپنے ماضی کی صحیح تصویر دیکھ کر اپنے مستقبل کو

امید افزا پاتے ہیں۔ کیونکہ ماضی اگر شاندار ہے تو مستقبل کو بھی شاندار بنانے میں حوصلہ بڑھتا ہے اور قومی خودی پیدا ہوتی ہے۔ اس لیے کسی قوم کو نقصان پہنچانے کا ایک کارگر حربہ یہی ہوتا ہے کہ اس کا ماضی خود اس کے سامنے بہت برے اور نفرت انگیز طریقہ پر پیش کیا جاتا ہے جس سے وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر متاثر ہو کر اپنی تمام تاریخی اور تمدنی روایات سے رفتہ رفتہ متنفر ہو جاتی ہے، اتفاق سے اس قسم کے حربے سے فائدہ اٹھانے کے لیے معاصر تاریخوں میں ہر طرح کا مسالہ موجود ہے۔

یہ معاصر تاریخیں عہد سپہ گری میں ایرانی مذاق کے مطابق لکھی گئیں، اس زمانہ میں سب سے بڑا ذاتی وصف سپہ گری میں کمال حاصل کرنا تھا، ہر فرد اپنا جوہر میدان جنگ میں دکھانا فخر سمجھتا تھا، اہل قلم، اہل سیف کی طرح لڑائی کے میدان میں شریک نہ ہو سکتے تھے تو اپنی سپہ گری کے سارے جذبات کاغذ کے صفحات پر منتقل کرنے کی کوشش کرتے تھے، اسی لیے ان کی ساری تاریخیں جنگ و جدل اور معرکہ آرائی کا مرقع ہیں، جن کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس عہد کی تاریخ محض کشت و خون کی داستان ہے، مُورخوں کے ان ذاتی رجحانات کے بنیاد پر تاریخ کے بہت سے اہم رُخ پر پردے پڑ گیے ہیں، اور اب معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد کے سلاطین نے لڑنے بھڑنے کے سوا اور کوئی کام ہی نہیں کیا، انگریزی داں طبقہ پر یہ خیال سر۔ ایچ۔ ایم۔ ایلیٹ کی تاریخ ہند کے ذریعہ سے اور بھی زیادہ گہرے طور پر منقوش ہوا، ہنری ایلیٹ کا یہ احسان ناقابل فراموش ضرور ہے کہ اس نے غیر معمولی تلاش و جستجو سے ہندوستان کی کمیاب اور نادر عربی جغرافیوں اور فارسی تاریخوں کا پتہ لگا کر ان کے انگریزی ترجمے اور اقتباسات اپنی مذکورہ بالا کتاب میں محفوظ کر دیے ہیں، اور آج بہت سے محققین کے لیے وہ ہدایت کا چراغ ہے، مگر یہ کہنا پڑے گا کہ ایلیٹ نے ان ترجموں میں دیانت داری سے کام نہیں لیا۔ جن کتابوں کے ترجمے اور اقتباسات اس نے اپنی کتاب میں شامل کیے ہیں۔ ان میں جابجا علمی، تمدنی، عمرانی اور غیر سیاسی تفصیلات کچھ نہ کچھ ضرور ہیں، لیکن ان کو اس نے قصداً حذف کر دیا ہے، اب فارسی سے ناآشنا اور ایلیٹ کی کتاب کو اپنا گائڈ

بنانے والا محقق مسلمان سلاطین کے عہد کو صرف خون آلود اور خون آشام بتاتا ہے جس کے ذہنی اثرات مدتوں کی تحقیق و کوشش کے بعد بھی مشکل سے مٹ سکیں گے ایلیٹ شروع انگریزی عہد کا آدمی ہے۔ اور یہ ایک گونہ سرکاری حیثیت بھی رکھتا ہے اور اس نے اپنے کام کا مقصد چھپا کر نہیں رکھا ہے۔ اس نے صاف طور سے ظاہر کر دیا ہے کہ اس کے پیش نظر تمام تر یہ ہے کہ اپنے اگلے پیش رو اور حاکموں کے غیر منصفانہ عہد کی تاریکی کو دکھا کر اپنی قوم کی عہد حکومت کی روشنی دکھائے، تاکہ ہندوستان کے رہنے والے اس کو سایۂ رحمت سمجھ کر اس کو اطاعت مندانہ اخلاص کا خراج عقیدت ہمیشہ پیش کیا کریں۔ (دیباچہ جلد اول صہ ۲۲)

ابھی عرض کیا گیا ہے کہ ہندوستانی کی تاریخیں لکھ کر زیر نظر عہد کے سیاسی واقعات تو مسلسل اور مربوط طریقہ پر مرتب کر دیے ہیں، لیکن ان ایرانی مذاق کے مورخوں نے بادشاہی درباروں سے باہر نکل کر دنیا کو دیکھنے کی کوشش نہیں کی، ان کے نزدیک بادشاہ کا دربار ہی ساری دنیا تھی۔ عرب اور ایرانی مؤرخوں کے نقطۂ نظر میں بڑا فرق ہے، عرب مورخ دربار کا مؤرخ نہیں ہوتا، بلکہ زمانے کا مؤرخ ہوتا ہے۔ اسی لیے اس کی تاریخ کی تقسیم بادشاہوں کے نام پر نہیں بلکہ سال پر ہوتی ہے، طبری، ابن اثیر، ابوالفداء وغیرہ مؤرخوں نے اسی طرز پر اپنی تاریخوں کی بنیادیں ڈالی ہیں، عرب کا مؤرخ نہ صرف بادشاہوں کی جنگ و صلح کے واقعات زیر تحریر لاتا ہے، بلکہ ضمناً اس زمانے کے تمدنی علمی اور معاشی حالات بھی ضرور قلم بند کرتا جاتا ہے، گو ان میں ترتیب نہیں ہوتی۔ ایک ابن بطوطہ کو دیکھ لیجیے کہ مغرب اقصیٰ کے اس سیاح کے ہاتھوں محمد تغلق کے عہد کا جتنا واضح اور روشن مرقع ہمارے سامنے موجود ہے، وہ اس دور کے کسی اور سلطان کی حکومت کا نہیں۔ ابن بطوطہ نے اپنے سفر نامہ میں بہت سے سیاسی واقعات ایسے بھی لکھے ہیں جن کا فارسی تاریخوں میں بہت کم پتہ چلتا ہے، لیکن تحقیقات نے ان کی صحت و درستی کو ثابت کر دیا ہے، معبر یعنی کارومنڈل میں حسن کیتھلی کی اسلامی ریاست کا اس نے ذکر کیا ہے، اس کا ثبوت آثار قدیمہ کے سکوں نے بہم پہنچایا، اور حیدرآباد کے حکیم شمس اللہ قادری نے سنہ ۱۹۲۸ء میں سلاطین معبر کے نام سے اس پر ایک اچھا مقالہ لکھا ہے، ملتان کے مدرسہ کا نام صرف ابن بطوطہ نے بتایا ہے، سندھ کے سومری بادشاہوں کی حقیقت بھی ابن بطوطہ

سے معلوم ہوئی، ہندوستان اور چین کی بحری تجارت کا حال اور جہازوں کی آمد و رفت کی کیفیت بھی اسی سے معلوم ہوئی، بنگال کا نقشہ اس نے فارسی کے دو حرفوں میں کھینچا ہے "جہنم پر از نعمت"، ترکستانی ترکوں نے بھی اسی کو یہی لقب دیا تھا، ملیبار میں اسلامی آبادیوں کا ذکر اسی نے کیا ہے، سندابور یعنی گوا کی عرب اسلامی سلطنت کا حال اسی سے معلوم ہوا، ہنور احاطۂ بمبئی کے عرب سلطان کی داستان اسی نے سنائی ملیبار اور جزائر کے ہندو راجاؤں کے قصے اسی سے معلوم ہوئے۔

محمد تغلق نے چونکہ مصر کے عباسی خلیفہ سے تعلق پیدا کر لیا تھا۔ اس لیے ہندوستان اور مصر کے درمیان سفیروں، سیاحوں اور علماء کی آمد و رفت کا دروازہ کھل گیا تھا اور اس راہ سے اس زمانہ کے ہندوستان کی تاریخ کا بہت سا سامان عرب مورخوں کے بھی ہاتھ آیا، چنانچہ اس عہد کے مصری مورخ ابن فضل اللہ المتوفی سنہ ۷۴۹ھ سنہ ۱۳۴۹ء نے اپنی کتاب مسالک الابصار فی ممالک الامصار میں اس زمانہ کے ہندوستان کے جو تمدنی و تجارتی اقتصادی اور فنی حالات لکھے ہیں اس عہد کی پوری تاریخ میں نہیں مل سکتے، ہندوستان کی کسی فارسی تاریخ میں آپ کو یہ لکھا مل سکتا ہے کہ ان سلاطین کے زمانہ میں ہندوستان کی تعلیم کا کیا حال تھا اور کتنے مدارس قائم تھے، لیکن ابن فضل اللہ کا بیان سنیے، جو لکھتا ہے کہ محمد تغلق کے زمانہ میں صرف دلی میں ایک ہزار مدرسے تھے شفاخانے اور دو ہزار خانقاہیں تھیں، بادہ مشہور شاہی مدرسہ جو فیروز شاہ تغلق کے زمانہ میں دلی میں شاہانہ فیاضی سے قائم ہوا تھا وہ کیسا تھا، اس کی تعلیم کیا تھی، کون کون بڑے بڑے مدرسین تھے، فارسی کی لفاظانہ انشا پردازی میں اس کا بیان گو برنی نے صفحوں میں کیا ہے، مگر اس کا حاصل کچھ نہیں، بدر چاچ اور مظہر کڑہ اس عہد کے دو شاعروں نے اس مدرسہ کا ذکر اپنے قصائد میں کیا ہے، اس کو پڑھ کر اس کی عظمت کا اندازہ کرنے کے لیے ہم آج بے قرار ہیں، مگر نہیں کر سکتے۔

مسالک الابصار کے بیان کا یہ حصہ جو ہندوستان کی تاریخ سے متعلق ہے فرانسیسی اور انگریزی میں ترجمہ ہو گیا ہے، اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ عرب مورخ کی نگاہ میں کتنی وسعت ہوتی ہے، ابن فضل اللہ کے بعد مصر کے دوسرے مورخ قلقشندی المتوفی سنہ ۸۲۱ھ سنہ ۱۴۱۸ء نے اپنی کتاب صبح الاعشیٰ فی کتابۃ الانشاء میں اس حصہ کو نقل کر دیا ہے۔

اور ہماری اکاڈمی نے چودہ برس ہوئے اس کا ترجمہ معارف دسمبر سنہ ۱۹۲۰ء میں شائع کردیا ہے، اس عہد کے عرب سوانح نگاروں نے بھی آٹھویں اور نویں صدی ہجری کے اکابر کے حالات میں اپنے زمانہ کے ہندوستانی بادشاہوں کو بھی جگہ دی ہے۔ جیسے ابن حجر مصری نے الدرر الکامنہ فی اعیان المایۃ الثامنہ میں شوکانی یمنی نے البدر الطالع فی قرن التاسع میں جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد کے متعدد سلاطین فضل و کمال کے لحاظ سے اہل علم میں شمار کیے جانے کے لائق تھے۔

اگر ہر دور میں ایک ابن بطوطہ، ابن فضل اللہ اور ایک ابوالعباس احمد قلقشندی ہوتا، تو آج ہندوستان کے زیر نظر عہد کی تاریخ اس سے مختلف ہوتی جو آج نظر آتی ہے۔

اپنے اس خطبے کو ختم کرتے ہوئے مولانا سلیمان ندوی نے فرمایا:۔

> "ہندوستان کی جو تاریخ لکھی جائے اس کا مقصد ہندوستان کے متفرق اجزا کو باہم جوڑنا ہو، توڑنا نہ ہو، حال کو ماضی کی ناگواری کی تلخی کو بڑھا کر کیوں برباد کیا جائے اور کیوں مستقبل کے لیے یہ کوشش کی جارہی ہے کہ وہ کبھی خوش آیند نہ ہوسکے۔
>
> ہندوستان کے مورخو! تم ہندوستان کی صرف تاریخ نہ لکھو، بلکہ اپنے کارناموں سے ہندوستان کی نئی تاریخ بھی بناؤ نیک ارادے سے اٹھو، خدا تمھاری مدد کرے گا۔

اتر پردیش اردو اکادمی کے

نثری انتخابات

وقت کے تقاضوں کو دیکھتے ہوئے اکادمی شعری اور نثری انتخابات شائع کر رہی ہے۔ اس سلسلے میں تین درجن سے اوپر کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں، چند نثری انتخابات کے نام مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ انتخاب مضامین سرسید	مرتبہ ڈاکٹر عتیق احمد صدیقی	۵/- روپے
۲۔ ،، مہدی افادی	،، ڈاکٹر فیروز احمد	۴/- ،،
۳۔ ،، میر ناصر علی	،، ڈاکٹر فیروز احمد	۴/- ،،
۴۔ ،، ذکاء اللہ	،، ڈاکٹر اصغر عباس	۵/- ،،
۵۔ ،، سجاد حیدر یلدرم	،، پروفیسر ثریا حسین	۲۳/- ،،
۶۔ ،، مضامین رشید احمد صدیقی	،، جناب شہاب الدین ثاقب	۶/- ،،
۷۔ ،، علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ	،، ڈاکٹر اصغر عباس	۳/۷۵ ،،
۸۔ ،، افسانہ	،، ڈاکٹر محمد عقیل رضوی	۱۲/- ،،